اس کے خلاف آواز بلند کی، ان کی جد وجہد کا تذکرہ اور شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کے دوسرے بزرگوں کے کارناموں کا ذکر ہے، نیز تقلید کے متعلق دیوبندی اور بریلوی مکاتبِ فکر پر تنقید بھی ہے، مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اہل حدیث کی تحریک نئی نہیں ہے، بلکہ اس کا سلسلہ ان محدثین سے جڑا ہوا ہے جن کا متقدمین اور متوسطین ہر دور کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، یہ محض حفاظ حدیث نہیں تھے، بلکہ ایک مستقل مدرسۂ فکر کے ترجمان تھے، کتاب پُر از معلومات ہے، مگر ظاہر ہے کہ دوسرے طبقہ و مسالک کے لوگوں کو اس سے اتفاق نہیں ہو سکتا، ہر ایک اپنے ہی مسلک کو قوی سمجھتا ہے، البتہ تقلید کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اصولی حیثیت سے راقم کو اس سے اتفاق ہے، مگر اس کی تائید و تردید میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس میں حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا جاتا ہے، یہ کتاب پہلے اردو میں شائع ہوئی تھی، پھر جامعہ سلفیہ بنارس کے لائق استاذ اور صوت الجامعۃ کے مدیر مولانا مقتدیٰ حسن ازہری نے اسے عربی میں منتقل کیا، ترجمہ اچھا ہے۔

محاسن الشعر الجزء الاول — مرتبہ مولوی محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ چھاپ، صفحات ۵۲، قیمت للعہ، پتہ: مکتبۂ اصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ

عربی اشعار کا یہ منتخب مجموعہ عربی کے دوسرے درجہ کے طلبہ کے لئے شائع کیا گیا ہے، اس میں دورِ رسالت سے اب تک کے مختلف شعراء کا کلام درج ہے، یہ اشعار توحید و معاد، زہد و اتقاء، بے ثباتیٔ عالم اور مکارم اخلاق پر مشتمل ہیں، حواشی میں ہر شاعر کا مختصر تعارف بھی ہے، اس کی ترتیب میں زبان و بیان کی سلاست، روانی کا بھی خیال رکھا گیا ہے تاکہ طلبہ کی ذہنی و فکری اصلاح بھی ہو اور ادبی تربیت بھی، یہ انتخاب عربی مدارس کے نصاب میں شامل کئے جانے کے لائق ہے۔ "ض"

جلد ۱۲۳ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۸ء عدد ۴

مضامین

عنوان	مصنف	صفحات
شذرات	عبدالسلام قدوائی ندوی	۲۴۲-۲۴۴
مقالات		
اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت	مولانا سید سلیمان ندویؒ	۲۴۵-۲۶۳
کریما سعدی	ڈاکٹر طلحہ رضوی برق صدر شعبۂ فارسی داؤد وجین کالج آرہ،	۲۶۴-۲۷۹
حافظ سخاوی کی تصانیف،	منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین	۲۸۰-۲۹۰
مسجد قرطبہ (فکری وفنی حیثیت سے)	جناب سید محمد ہاشم صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	۲۹۱-۳۰۲
مولانا شبلی کے ایک استاد (مولانا فیض اللہ مئوی)	جناب مولوی حبیب الرحمن صاحب ندوی مئو، اعظم گڈھ،	۳۰۳-۳۱۲
ادبیات		
غزل	جناب عبدالباری صاحب عشق خلف منشی ممتاز علی آہ مرحوم تلمیذ امیر مینائی،	۳۱۳-۳۱۴
غزل	ڈاکٹر سلام سندیلوی	۳۱۴
کلام شبلی	مترجمہ جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ رامپور	۳۱۴
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۱۵-۳۲۰

شذرات

گزشتہ ماہ ان اوراق میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا، خوشی ہوئی کہ لوگوں نے انھیں بہت پسند کیا، اور اپنے اپنے حلقوں میں ان کی اشاعت کی، ان میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، ایک یہ کہ مسلمان اپنی سیرت کو بے داغ، اپنی زندگی کو پاکیزہ اور اپنے کردار کو بلند کریں، وہ خود غرضی سے پاک نام و نمود سے بے نیاز، اور جاہ و منصب کی ہوس سے محفوظ ہوں، وہ اپنے مفاد پر قوم و ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں، اور اپنے فائدہ کے بجائے، اپنے بھائیوں کے فائدہ کی فکر غالب ہو، اگر وہ خلوص کے ساتھ خدا کے بندوں کی خدمت کریں گے، تو نصرتِ خداوندی اُن کی دستگیری کرے گی، اور اللہ فی عون العبد ما دام العبد فی عون اخیہ کا قدم قدم پر ظہور ہوگا، خدمت عظمت کی راہ کھول دے گی، اور عزت و سرفرازی کا مقام بلند نصیب ہوگا،

دوسری بات یہ ہے کہ سیرت کی پاکیزگی، اور اخلاص کے ساتھ وہ اپنی استعداد و صلاحیت کار میں بھی اضافہ کریں، زندگی کے میدان میں آگے رہنے کی کوشش کریں کسل و غفلت سے دور رہیں اور سست گامی اور پس روی کے بجائے ہر راہ میں پیش قدمی کو اپنا شعار بنائیں کسی معاملہ میں رعایت اور نظرِ عنایت کے طالب نہ ہوں، بلکہ اپنی لیاقت و کارکردگی کے سہارے آگے بڑھیں، اور رحم و کرم کی درخواست کے بجائے اپنے اندر ایسی قابلیت پیدا کریں کہ لوگوں کی نگاہیں خود اُن کی طرف اٹھیں اور باصرار اہم مناصب ان کے سپرد کئے جائیں، رفیع احمد قدوائی مرحوم کو بھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا، سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے کبھی کسی عہدہ کی درخواست نہیں کی، بلکہ ہمیشہ عہدے ان کے پیچھے دوڑتے رہے، جو کام مشکل نظر آیا اُن کے سپرد کیا گیا، اور انھوں نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے انجام دیا کہ لوگ دنگ ہو گئے، اس زمانہ میں ملک میں غذا کی بڑی قلت

محسوس ہوتی تھی، کئی نامور وزیر اس معاملہ میں ناکام ہو چکے تھے، بالآخر رفیع صاحب کے سپرد یہ خدمت کی گئی، اور انھوں نے ایسی خوش تدبیری سے کام کیا کہ غلہ کے ذخیروں کے بازار پٹ گئے اور وہ ارزانی ہوئی کہ آج تک لوگ یاد کرتے ہیں،

وزارت کے بعد ملازمت کی سطح پر بھی آپ کو ایسے مسلمان نظر آئیں گے جو اپنی نیک و سعی، ذہانت اور صلاحیت کار کی بنا پر ہر طبقہ میں قدر و اعتماد کی نظر سے دیکھے گئے، یوپی کے آئی سی ایس افسر سید صدیق حسن مرحوم سے سب لوگ واقف ہیں، انگریزی عہد میں بھی ان کی حریت پسندی اور آزاد خیالی کی شہرت تھی، اور کانگریس کے دورِ حکومت میں بھی اُن کی آزادی و خودداری کی وہی شان رہی، انھوں نے کبھی اپنی عزت و خودداری پر آنچ نہیں آنے دی، نہ کبھی خوف و ہراس اُن کے پاس پھٹک سکا، مگر اس کے باوجود سب اُن کی قابلیت اور ایمانداری کے معترف تھے، اور کسی متعصب سے متعصب وزیر نے بھی اُن کی تعریف و توصیف میں کوتاہی نہیں کی، جو کام اُن کے سپرد کیا گیا، انھوں نے اس خوبی سے انجام دیا کہ لوگ عش عش کرنے لگے، اُن کے ایک ساتھی سابق ریوینیو سکریٹری شیخ ظہور الحسن کا بھی یہی حال تھا، اُن کی دیانت، قابلیت اور بے لوث خدمت کا سب کو آج تک اعتراف ہے،

ملازمت کے علاوہ کاروباری زندگی میں بھی اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، ۱۹۴۷ء کا ہولناک خون آشام زمانہ ابھی بھولا نہ ہوگا اس خطرناک زمانہ میں دہلی کے ایک بسے محلہ میں جو ہندو اور سکھ پناہ گزینوں سے پٹا تھا، ڈاکٹر خادم حسین نے اپنا مطب جاری رکھا، اُن کی بے لوث زندگی اور بے غرض خدمت نے دشمنوں کے دلوں میں گھر کر لیا، اور مخالف معتقد بن گئے، وہ مریضوں کو توجہ سے دیکھتے، اور نسخہ لکھ دیتے مگر کبھی دام نہ مانگتے کسی کا جی چاہتا تو فرش پر پیسے ڈال دیتا، ورنہ دوا لے کر چلا جاتا! اور ڈاکٹر صاحب بے نیازی کیساتھ مریضوں کو دیکھتے رہتے، ساری زندگی اُن کا یہی معمول رہا، اُن کی اس بے نیازی نے انھیں لوگوں کی محبت و عقیدت کا مرکز بنا دیا،

اب ایک ایماندار تاجر کا حال سنئے، فتحپوری میں حاجی محمد اسمٰعیل کی سامانِ عامہ کی ایک دکان تھی، ان کے حسن معاملہ کی ایسی شہرت تھی کہ اُن کی دوکان کے سامنے خریداروں کا ہجوم رہتا تھا، دس دس بارہ بارہ آدمی سامان دیتے، مگر اس کے باوجود ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی، ۱۹۴۷ء اور اُس کے قریب کے پُر آشوب زمانہ میں بھی حاجی صاحب کی ساکھ میں کوئی فرق نہیں آیا، اور اس مسلم دشمنی کی فضا میں بھی اُن کی دوکان کے سامنے غیر مسلموں کی

قطاریں لگی رہتی تھیں بار ہا یہ منظر میں نے خود دیکھا ہے بازار میں قریب ہی اور دوکانیں موجود تھیں مگر لوگ اُنکا رُخ نہیں کرتے تھے، اُن کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ حاجی صاحب کے یہاں مال بھی اچھا ملے گا اور دام بھی واجبی ہوں گے،

اخلاص وحسن عمل سے ناساز گار حالات کس طرح ساز گار ہوجاتے ہیں، عداوت محبت سے بدل جاتی ہے، اور دشمن دوست بن جاتے ہیں اُس کا ایک نمونہ دیکھئے، پانی پت اسلامی علوم و فنون، اسلامی تہذیب تمدن اور اسلامی روایات کا بڑا مرکز تھا، یہاں چپہ چپہ پر بزرگان سلف کے نقوش ثبت تھے، اور شجر و حجر عظمت ماضی کی داستانیں سنا رہے تھے لیکن جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی، اور مغربی پنجاب سے پناہ گزینوں کے قافلے مشرق کی طرف بڑھے تو پانی پت بھی زد میں آگیا، اور صدیوں کی جمی ہوئی مسلم آبادی آن کی آن میں تتر بتر ہوگئی، لیکن اس خوفناک زمانہ میں مولانا لقاء اللہ کے قدموں میں لغزش نہیں آئی، اور وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے، اُن کے اعزہ و اقربا ہی نہیں، اہل و عیال تک پاکستان چلے گئے، مگر مولانا کی ثبات قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا، اور کچھ ہی عرصہ میں اپنے ایمان و اخلاص، اعتماد علی اللہ، بے غرض خدمت اور بہی خواہی خلق کی بنا پر سب کی آنکھ کا تارا بن گئے، اور ہندو پناہ گزیں دیوتا کی طرح اُن کی عزت کرنے لگے، اُن کی ہمت نے دوسروں کی ہمت بندھائی، اور آج بھی پانی پت میں اللہ کا نام لیا جارہا ہے،

اوپر کی سطور میں تاریخی مثالوں کے بجائے قصداً ان اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے تھے، یہ واقعات بتاتے ہیں کہ کس طرح اللہ کے مخلص بندوں نے بندگانِ خدا کی خدمت کرکے اللہ کی رضا بھی حاصل کی، اور اس کے بندوں کی خوشنودی بھی، اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنی قوم کے لئے بھی عزت کا مقام حاصل کیا، ہم اپنے استاد مولانا حمید حسن خاں کے یہاں دیکھا کرتے تھے کہ مختلف خیالات و عقائد کے لوگ اُن کے پاس آتے، اور اُن کے حسن سلوک سے متاثر ہوکر مسلمانوں کے گرویدہ ہوجاتے تھے، میں نے خود اپنے کانوں سے بعض نامور ہندوؤں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس قوم میں آپ کے جیسے برگزیدہ اصحاب موجود ہوں ہم اُس کے مخالف کیسے ہوسکتے ہیں،

مقالات

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

از

مولانا سید سلیمان ندویؒ

(۲)

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے، اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں حمایت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینھ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے، خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کرکے فرمایا:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا	اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری
وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ، وَ	اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے
لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں)

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ (مائدہ : ۹)

ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں، ان کو قائم رکھتے، تو (ان پر رزق مینھ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انھوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (اعراف : ۱۲)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے مگر انھوں نے تو تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور : ۷)

جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا

تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (فتح : ۳)

کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لئے ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۙ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الصف : ۲)

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دیگا اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشتہائے جاودانی میں (تیار) ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو، (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو۔

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (توبہ : ۵)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشنگوئی دو دفعہ اور سورہ فتح و سورہ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ توبہ اور فتح والی پیشنگوئی کفار کے اور سورہ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے، یہ پیشنگوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آیندہ پوری ہونا ہے، اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کے لئے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی، جیسا کہ سورہ فتح کی پیشنگوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال: ۵)

اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم خدا کے لئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی وجسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو، وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ

(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے

اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ ..... وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (فتح : ۳)

بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی غنیمتیں جو انھوں نے حاصل کیں اور خدا غالب حکمت والا ہے، خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کروگے، تو اس نے غنیمت کی تمھارے لئے جلدی فرمائی، ..... اور اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اس سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (فتح : ۱)

(اے محمد) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ

سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدہ کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ
فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (نصر: ۱)

جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے
دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ در گروہ
داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی
حمد کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت چاہو

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہونچ گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہونچ گیا، اس موقع پر ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع و حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کرسکیں، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي
الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک
کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے
کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ
بِي شَيْئًا ۚ
(نور: ۷)

ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور
ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے
پسند کیا ہے، مستحکم و پایدار کرے گا، اور
خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری
عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی
اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اُسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے، اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا، کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا۔

لہ سیرۃ ابن ہشام۔ وفد رؤسائے قریش کی گفتگو۔

اسی لئے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کے مطالبے کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شاہنشاہ علی الاطلاق ہے جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمراں ہے اور وہی زمین پر فرماں روا:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (زخرف ۱۰) — اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں۔

وہ دیبیوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیبی ہوگی، نہ دیوتا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور کسریٰ اور جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، مزمل کے آخر میں جو آغازِ وحی کا سورہ[1] ہے، مسلمانوں کو بشار کیا جاتا ہے:

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (مزمل : ۲) — (اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے، جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانہ میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل، بیہقی و حاکم و احمد

پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمھیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمھیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضورؐ نے سورہ فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آگیا، اور واپس آکر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے نہ جادو ہے، اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منھ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے، تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی:

اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے، تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں

عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولتمند بن جاؤ، اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے:"

یہ سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کوئی بات بھی نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہئے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ تم کو اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیرخواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی . . . شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس کے لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح، عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجاتی تھی اور اسی لئے اس کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صلح ہو جائے، ابو طالب بھتیجے سے کہتے ہیں "جان پدر! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور کچھ وہ تم کو دینا چاہتے ہیں"، ارشاد ہوا: "اے عم بزرگوار!

میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے آپ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم آپ کے زیرنگیں ہوگا، ابوجہل نے کہا ہم آپ کے باپ کی ایک بات نہیں، دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔[1]

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں، اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: "اے لوگو! کہو خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوں گے، اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے۔[2]

بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول اللہ علیہ السلام کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار رہو، سب نے کہا ہاں، انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے، اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی

---

[1] سیرت ابن ہشام [2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۳۵، لائیڈن۔

کروگے، انصار نے ایک آواز سے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن مجھے اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت اور فتح و نصرت[1]۔

اس لئے یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمہ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے، اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا، اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر ایسے زمانوں میں جب اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی، صحابہؓ کو شہروں اور ملکوں کے بڑے بڑے فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انھیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا، اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بدم خبریں آرہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آرہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جاں نثار صحابہ بھوکے اور پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں، ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے، جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدال راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہے ہیں، حضورؐ آتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری سی نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلی

۱ طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹، لائیڈن۔

کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضورؐ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند بھوکے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال کے بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر اور کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کروگے، مداین تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم لوٹو گے، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی[1]۔

لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہئے کہ یہ ملک، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش و عشرت، یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال، سوء مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لئے ضروری ہے کہ اس کی طرف جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لئے ہے

۱ ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی جلد سوم میں پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی، اور اگر آخرت کیلئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لئے فوز و فلاح کا موجب ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (شوریٰ: ۳)	جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے، اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔
وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران: ۱۵)	اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو، اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکرگزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہوشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل: ۶)	اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لئے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (توبہ: ۶)	کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہوگئے، تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت ... میں بہت معمولی ہے۔
وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (قصص: ۶)	اور جو چیز تم کو دی گئی ہے، وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے، اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم سمجھتے نہیں
بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (اعلیٰ: ۱)	مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔
وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (اعراف: ۲۱)	اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں:

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ	پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور آخرت کا عذاب تو بہت

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (زمر : ۳) — بڑا ہے، کاش یہ سمجھ رکھتے۔

وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَى (طٰہٰ : ۷) — اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کرے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھرے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (ہود : ۲) — جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ انھیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انھوں نے دنیا میں کئے، سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاہ سے بھی کمتر ہے۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ (توبہ : ۶) — دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

وَمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ (رعد : ۳) — اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکا کے سوا کچھ نہیں۔

وَمَا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (آل عمران ۱۹، حدید ۲) — اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے، جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے: إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَأَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ : ۳) — وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، تمھارے لئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ اور خود انسان کس لئے بنا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات : ۳) — اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کا ذریعہ بنایا جائے کہ دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (قصص : ۷) — اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے، اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

انھیں معنوں میں الدنیا مزرعۃ الآخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیا کی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے

ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔

(نور : ۷)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا، اور خوف کے بعد امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں، اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت، اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں، اور اگر اس امن و اطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہریگا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

(حج : ۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں، اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

کریما سعدی

از

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ صدر شعبۂ فارسی و اردو جین کالج، آرہ۔

ہمہ سرمایۂ سعدی سخن شیریں بودہ — ویں از و ماند ندانم کہ چہ با او بردہ

تقریباً بارہ ۱۲ سال قبل روس میں فارسی گو شعراء کی ایک کانفرنس بنام "کنگرہ لے برائے شعرائے ایران" انعقاد پذیر ہوئی، اس کے تحت ایک عظیم الشان بین المللی فارسی مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں ایران، افغانستان، تاجیکستان، ہندوستان اور پاکستان کے فارسی گو شعراء شریک ہوئے تھے، سوینار کے طور پر ایک کتاب "جنگ" بھی بڑے اہتمام سے شائع ہوئی، جو شرکائے مشاعرہ کے کلام پر مشتمل تھی، جنگ میں ایک مشہور ایرانی ادیب و شاعر دکتر باستانی پاریزی، استاد دانشگاہ طہران کسی اشتباہ کی بنا پر پاکستانی شاعر کی حیثیت سے چھپ گئے اور اس بنیاد پر پاکستان کے ایک دو شعری تذکروں میں بھی انھیں پاکستانی شاعر کی حیثیت سے شریک کر لیا گیا۔

ڈاکٹر باستانی پاریزی اس واقعہ کو اپنے ایک دلچسپ سفرنامے میں جو بالاقساط مجلۂ 'یغما' (ایران) میں شائع ہوا لکھتے ہیں کہ

"تصور بفرمائید امروز کہ قرن چاپ و روز بے سیم و تلگراف و آشنائی شرق و غرب باہمکس است، شعرے از دگمی چوں مخلص زمزمہ ہائے آہنیں و سیم ہائے خاردار عشق آباد گذشتہ و تاجیکستان و مسکو رسیدہ، شاعرے پاکستانی بوجود آوردہ، آیا آں تذکرہ نویسان پانصد و ششصد سال پیش حق نہ داشتند کہ نمی دانستند نظامی گنجہ اے است یا قمی؟ و قبر ابن سینا در ہمدان است یا اصفہان؟ و چشمہائے رودکی در خردسالی کور شدہ بود یا در سنین جوانی و بالاتر ازاں؟ و نام سعدی مصلح الدین بودہ یا مشرف الدین؟"

(یغما، شمارۂ ۲۶۱ صفحہ ۱۵۷)

اس تمہید سے مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ مرور ایام کا دبیز پردہ اکثر صرف شاعر کے صحیح نام و نسبت پر ہی نہیں بلکہ اس کے کلام پر بھی پڑا رہتا ہے اور صدیوں بعد حقائق کی تلاش میں اس کی بازیافت ہوتی ہے، ایک عرصہ تک سعدی کے صحیح نام سے متعلق محققین کی رائے مختلف تھی، کچھ مصلح الدین لکھتے تھے، کچھ مشرف الدین بن مصلح الدین وغیرہ، سب سے پہلے مشہور مستشرق ڈاکٹر ایڈورڈ براؤن نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں کلیات سعدی کے ایک قدیم نسخہ کے حوالہ سے سعدی کا نام مشرف الدین بن مصلح الدین عبداللہ لکھا، کلیات سعدی کا یہ نسخہ ان کے انتقال کے صرف ۳۷ سال بعد یعنی ۱۳۲۸ء میں رقم ہوا تھا، جو انڈیا آفس لندن کی لائبریری میں نمبر ۸۷۶ کے تحت موجود ہے۔

اس وقت ادبیات ایران کی مختصر مگر جامع تاریخ مصنفہ دکتر رضا زادہ شفق مشہور رہی ہے اور مستند سمجھی جاتی ہے، اس میں بھی سعدی کا نام مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی لکھا ہے، مشہور و مستند مورخ ادبیات و فرہنگ ایران دکتر ذبیح اللہ صفا بھی گنج سخن جلد دوم میں شیخ مشرف بن مصلح شیرازی ہی لکھتے ہیں۔

یہ تو نام کی بات ہوئی، جہاں تک کلام کا تعلق ہے، شیخ سعدی شیرازی کی کریما ہندوستان میں عہد قدیم سے ہی ابتدائی نصاب کی اہم ترین اخلاق آموز کتاب سمجھی گئی ہے، اس نسل سے قبل کا

تقریباً ہر خواندہ شخص اس کتاب سے واقف ہے اور کچھ نہ کچھ اشعار اس کے ضرور گوشۂ ذہن میں محفوظ رکھتا ہے ، مثلاً مشہور ترین شعر :

کریما ببخشائے بر حالِ ما — کہ ہستم اسیر کمند ہوا

اس شعر کے پہلے لفظ سے ہی یہ کتاب موسوم ہوئی اور یہ شعر اس قدر زبان زد خاص و عام ہوا کہ مختلف شعراء نے تفننِ طبع کے طور پر اس کی پیروڈی لکھی ، مثلاً اکبر الہ آبادی کا یہ شعر بہت مشہور ہوا :

کریما بہ بخشائے بر حال بندہ — کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

علاوہ ازیں کریما کے مندرجۂ ذیل اشعار عوام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں :

چہل سال عمر عزیزت گذشت — مزاج تو از حالِ طفلی نہ گشت

بخیل ار بود زاہد بحر و بر — بہشتی نہ باشد بہ حکم خبر

تکبر عزازیل را خوار کرد — بزندان لعنت گرفتار کرد

سخاوت کند نیک بخت اختیار — کہ مرد از سخاوت شود بختیار

میرے پیش نظر ۱۹۶۹ء کا نسخہ مترجم کریما جلی قلم مطبوعہ مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ ہے ، جو چھ ہزار کی تعداد میں چھپا تھا ، اس کے بعد بھی اس کے ایڈیشن آ چکے ہیں ، اس سے ہندوستان میں آج بھی جب کہ فارسی تو فارسی اردو کا مستقبل بھی معرض خطر میں ہے ، کریما کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ موجودہ تحقیق کی روشنی میں سعدی سے متعلق جتنی تحریریں سامنے آ رہی ہیں اُن میں سعدی کی کریما کا کہیں کوئی ذکر نہیں ، جس سے یہ شبہہ تقویت پاتا ہے کہ آیا دو سو اشعار پند و نصائح پر مشتمل یہ مشہور و مقبول مہذب اخلاق کتاب کریما شیخ سعدی کی

تصنیف ہے بھی یا نہیں ؟ کریما کا آخری شعر تو یہی کہتا ہے کہ اس کے مصنف سعدی ہیں :

ز سعدی ہمیں یک سخن یادگار — نہ دل بر یں دہر نا پائیدار

کریما کے اشعار کا نمایاں طرز و اسلوب و ادا و سبک مخصوص سعدی شیرازی کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے ؟

پھر کیا سبب ہے کہ ہندوستانی و ایرانی محققین ارجمند اپنے تحقیق پاروں میں اس تصنیف لطیف کا ذکر تک نہیں فرماتے ، مثلاً

"تصانیف سعدی" کے تحت ڈاکٹر محمد عبدالاحد خاں خلیل اپنے تفصیلی مقدمۂ گلستان مترجم مطبوعہ ۱۹۶۵ء میں تحریر فرماتے ہیں :

• سعدی کی تصانیف کی تعداد ۲۳ بتائی جاتی ہے جن میں گلستان اور بوستان ان کی مقبول تر اور مشہور ترین تصانیف ہیں ، علاوہ ازیں مجالس پنجگانہ ، نصیحت الملوک ، رسالہ عقل و عشق اور تقریرات ثلاثہ بھی ان کی اہم تصانیف میں شامل ہیں ..... انھوں نے شعر و سخن کے سلسلہ میں عربی و فارسی قصائد لکھے اور مراثی ، قطعات ، ترجیعات ، رباعیات ، مثلثات (جن میں تین زبانیں عربی ، فارسی اور ترکی شامل ہیں) اور غزلیں لکھیں ، مطایبات ، مفردات ، ملمعات ، طیبات اور بدائع لکھے اور ہزلیات بھی :

(مقدمۂ گلستاں مترجم مطبوعہ لکھنؤ ، ص ۱۸ ، ۱۹)

فاضل محقق تو یقیناً کریما پڑھنے کی سعادت حاصل کر چکے ہوں گے ، اس سے متعلق مثبت یا منفی کسی رائے کا تو اظہار فرماتے ، انھوں نے کریما کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ۔

آقائے دکتر رضازادہ شفق رقم طراز ہیں :

ان دو تصانیف (گلستاں و بوستاں) کے سوا استاد (سعدی) کے قصائد ، غزلیات ،

قطعات، ترجیع بند، رباعیات، مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں جو ان کے کلیات میں جمع کر دئے گئے ہیں۔"

(تاریخ ادبیات ایران، مترجمہ مبارز الدین رفعت ص ۳۳۲)

"کنگرۂ جہانی سعدی و حافظ" (ایران) کی طرف سے بکوشش استاد دکتر منصور رستگار ایک ضخیم کتاب بعنوان "مقالاتے دربارۂ زندگی و شعر سعدی" مشتمل بر ۲۶ مقالہ بڑے حسن اہتمام سے شائع ہوئی ہے، ان مقالات میں ایرانی و افغانی اساتید اور محققین نے ہمہ جہتی انداز سے سعدی کی زندگی اور کارناموں پر واضح روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، بڑی تقطیع پر باریک ٹائپ میں چھپی ساڑھے چار سو صفحات کی اس کتاب میں سعدی کی کریما کا نام تک نہیں ہے۔

آقاے دکتر جاوید (افغانستان) اپنے مقالہ "یک نسخۂ کہن از کلیات سعدی" میں فرماتے ہیں: (واضح ہو کہ یہ نسخۂ کہن کلیات سعدی ڈاکٹر براؤن والے نسخۂ انڈیا آفس لائبریری لندن سے مختلف اور اس سے دو سال قبل کا ہے)

"در گنجینۂ گراں بہاے کتاب خانۂ سلطنتے افغانستان (تید شمارہ ۲۲۹۰) از کلیات حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ ہست کہ درست سی و پنج سال پس از وفات شیخ نوشتہ شدہ، و یکے از قدیم ترین نسخۂ کلیات موجود شیخ در جہان است"

(زندگی و شعر سعدی، ص: ۴۶)

آگے چل کر اس نسخۂ کہن کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں:

"مقدار و تعداد غزلیات نسبت بہ نسخہاے دیگر و کلیات چاپی بسیار کم است، شاید در مقام تشخیص غزلہاے مملوک و منسوب بہ سعدی بتواں آں را ملاک اعتبار و اعتماد قرار داد"

نام و ترتیب کتابہا و رسائل شیخ دریں نسخہ بدیں گونہ است:

۱. گلستان
۲. سعدی نامہ (بوستاں)
۳. طیبات
۴. بدائع
۵. خواتیم
۶. غزلیات قدیم
۷. قصائد فارسی
۸. کتاب المراثی
۹. قصائد عربی
۱۰. مثلثات
۱۱. ملمعات
۱۲. ترجیع
۱۳. سؤال صاحب دیوان
۱۴. رسالۂ انکیانہ
۱۵. رسالۂ عقل و عشق
۱۶. نصیحۃ الملوک
۱۷. صاحبیہ
۱۸. مجلس الہزل
۱۹. خبثیات
۲۰. مقطعات
۲۱. رباعیات
۲۲. مفردات

(زندگی و شعر سعدی
ص ۴۷، ۴۸)

کیا یہ بات تعجب خیز نہیں کہ اتنے قدیم نسخۂ کلیات سعدی میں جو شیخ کی وفات کے صرف پینتیس[۳۵] سال بعد ضبط تحریر میں آیا ہو، جہاں ہزل و خبثیات تک جمع ہوں، وہاں کریما کا کوئی نشان بھی نہیں، وہ ہزل و خبثیات جنھیں شیخ کی طرف منسوب سمجھا جا رہا ہے، اس کہن ترین نسخہ میں موجود دیکھ کر دکتر جاوید یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ

"علی الرغم بسا کلیات، قسمتہاے ہزلیات و خبثیات دریں کلیات مندرج است و بایں ترتیب شائبۂ عدم انتساب آں را بشیخ ضعیف تر می سازد" (کتاب ہذا: ۴۰)

اسی طرح محقق دانشمند ایران دکتر زہرای خانلری (کیا) اپنی تصنیفِ لطیف "فرہنگ ادبیات فارسی دری" میں احوال سعدی کے ضمن میں تحریر فرماتی ہیں،

"آثار سعدی عبارت است از دیوان غزلیات شامل طیبات، بدایع، خواتیم، غزلیاتِ قدیمہ۔ دیگر: بوستان، گلستان، قصائد و ملمعات، رباعیات و ترجیعات است۔ مجموع آثار سعدی را کلیات سعدی گویند۔"

(فرہنگ، ص: ۲۶۹)

اور یہ کلیات سعدی بڑے حسن سلیقہ، ترتیب و تصحیح اور "ذکاء الملک" محمد علی فروغی مرحوم کے تفصیلی مقدمہ و شرح حال سعدی کے ساتھ "سازمان انتشاراتِ جاویدان" ایران نے باریک ٹائپ میں بڑی تقطیع کے نو سو پندرہ صفحات پر شائع کیا ہے، افسوس اس کلیات میں بھی کریما کا کہیں کوئی ذکر نہیں، اس کتاب میں قدیم ترین مرتب و مدون دیوان (کلیات) آقائے ابوبکر بیستون کا مختصر مگر دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں موصوف رقمطراز ہیں:

"پس بداں اے عزیز من وفقک اللہ تعالیٰ مراضیہ (بیستون) کہ جمع آورندۂ دیوان شیخ رحمۃ اللہ علیہ در اصل وضع بنیاد بر بیست[۲۲] و دو کتاب کردہ بود، شانزدہ[۱۶] کتاب و شش[۶] رسالہ و بعض بہ ہفت رسالہ بنوشتند، چنانچہ بیست[۲۳] و سہ می شد، سبب آں کہ مجلس ہزل ہم در اول داخل رسالہ شش گانہ نوشتہ بودند، بندہ ایں رسالہ را از اول بآخر کتاب نقل کردم و داخل مطائبات کردم کہ در اول کتاب خوش آیند نمی نمود تا بیست[۲۲] و دو شد، و باقی را ہیچ تصرف نہ کرد، و ہم براں ترتیب گذاشت:"

(کلیات شیخ سعدی، چاپ ایران ص: ۴)

مشہور ایرانی دانشور و صاحبِ قلم جناب آقائے علی دشتی نے بھی ایک جامع و وقیع کتاب

"قلم و سعدی" لکھی ہے، پندرہ[۱۵] فصول میں چار سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب شیخ سعدی کی نگارشات کا ایک مبسوط ناقدانہ جائزہ ہے، اس کے ہر باب کو ہم مصنف کی بالغ نظری، دقیقہ رسی، اور محققانہ انداز فکر کا آئینہ کہہ سکتے ہیں، اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ میرے مطالعہ میں جو نسخہ ہے وہ چاپ چہارم ہے اور اس کی ہر اشاعت تین ہزار نسخوں پر مشتمل ہے۔ صد افسوس کہ مروجہ کریما سعدی کا کوئی ذکر اس کتاب میں بھی نہیں۔

۱۹۰۵ء میں صوبہ بہار کے شہر آرہ ضلع شاہ آباد کے باشندہ ٹاؤن اسکول آرہ کے ہیڈ ماسٹر بابو پرمانند صبر آروی نے کریما کے جواب میں منظوم "رحیما" لکھی اور اسے پانچ سو[۵] کی تعداد میں اسٹار آف انڈیا پریس آرہ نے شائع کیا، اب یہ کتاب بظاہر نایاب ہے، جناب صبر آروی فارسی زبان و ادب کے ایک فاضل ادیب اور کہنہ مشق شاعر تھے، جیسا کہ رحیما کے جائزہ سے معلوم ہوگا، میں ذیل میں کریما اور رحیما کا ایک سرسری تقابلی جائزہ پیش کر رہا ہوں، اس سے ظاہر ہوگا کہ "سبک سعدی" میں اہل زبان و ادب کس طرح خامہ فرسائی کرتے آئے ہیں:

"کریما" از شیخ سعدی شیرازی			"رحیما" از پرمانند صبر آروی		
شمار	عنوان	تعداد اشعار	شمار	عنوان	تعداد اشعار
۱.	مناجات	۳	۱.	مناجات	۶
۲.	نعت	۳	۲.	در نعت	۶
۳.	خطاب بہ نفس	۳	۳.	اشارت بہ نفس	۶
۴.	در مدح کرم	۶	۴.	در مدح کرم	۶
۵.	در صفت سخاوت	۵	۵.	در صفت سخاوت	۶

کریما			رحیما		
۶.	درمذمت بخیل	۷	۶.	درمذمت بخیل	۱۲
۷.	درصفت تواضع	۱۳	۷.	درصفت تواضع	۱۲
۸.	درمذمت تکبر	۷	۸.	درمذمت تکبر	۷
۹.	درفضیلت علم	۸	۹.	درفضیلت علم	۲۰
۱۰.	درامتناع از صحبت جاہلاں	۹	۱۰.	درامتناع از صحبت جاہلاں	۲۰
۱۱.	درصفت عدل	۱۰	۱۱.	درصفت عدل	۱۲
۱۲.	درمذمت ظلم	۸	۱۲.	درمذمت ظلم	۸
۱۳.	درصفت قناعت	۷	۱۳.	درصفت قناعت	۶
۱۴.	درمذمت حرص	۱۱	۱۴.	درمذمت حرص	۱۲
۱۵.	درصفت طاعت وعبادت	۱۳	۱۵.	درصفت عبادت وطاعت	۷
۱۶.	درمذمت شیطان	۹	۱۶.	درمذمت شیطان	۷
	دربیان شراب	۸	۱۷.	دربیان شراب محبت وعشق	۸
۱۸.	درصفت وفا	۶	۱۸.	درصفت وفا	۵
۱۹.	درفضیلت شکر	۶	۱۹.	درفضیلت شکرگوید	۵
۲۰.	دربیان صبر	۸	۲۰.	دربیان صبر	۶
۲۱.	درصفت راستی	۵	۲۱.	درصفت راستی	۵
۲۲.	درمذمت کذب	۶	۲۲.	درمذمت کذب	۵
۲۳.	درصفت حق تعالیٰ	۲۳	۲۳.	درانقلاب روزگار وتفاوت مدارج	۲۳
۲۴.	درمنع امید از مخلوقات	۱۶	۲۴.	درمنع امید از مخلوقات	۱۸
		۲۰۰			

کریما			رحیما
۲۵.	غزل مشتمل بر صنایع لفظی	۹	
	کل اشعار	۲۰۹	کل اشعار ۲۲۹

رحیما کے آخر میں بابو پرمانند صبر آروی کی فارسی غزلیں بھی شامل ہیں۔ میرے پاس رحیما کا جو نسخہ موجود ہے اس کے آخر کے صفحات غائب ہیں، صرف تین مکمل غزلیں موجود ہیں، اور چوتھی غزل کا صرف مطلع ہے، پہلی غزل آٹھ شعر کی، دوسری بھی آٹھ شعر کی، تیسری سات شعر کی اور چوتھی کا صرف مطلع، نہیں معلوم مزید اور کتنی غزلیں کتنے صفحات پر چھپی تھیں، اتنا کچھ بڑی سائز کے صرف چودہ[۱۴] صفحات پر ہی دستیاب ہے۔

فارسی زبان و اظہار بیان پر صبر کی قدرت کا اندازہ ان کی غزلوں کے درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے، سادگی زبان اور روانی بیان ملاحظہ ہو:

ستائش کنم خالق دوسرا را — کہ تخلیق فرمود ما و شما را

ببیں سوئے عاصی زچشم عنایت — کرم کن بریں خستہ پروردگارا

بہ پرہیز از عشوۂ زال دنیا — مدہ جا بدل دولتِ بے بقا را

بمنزل رسیدن اگر صبر خواہی
بداں ہادی گمرہاں مصطفےٰ[ؐ] را

ہیہات کہ در الفت آں زلف دوتا تو — اے صبر قدم می نہی در دام بلا تو

تاچند تغافل ز مریضانِ محبت — از بہر خدا گیر خبر چارہ گرا تو

ہان موسم گل آمدہ اینک بگلستاں — اے بلبل خوش لہجہ بشو نغمہ سرا تو

فنکار و جفا پیشہ حسینان جہان اند
صد حیف کہ دل می دہی اے صبر کرا تو

کریما	رحیما
اے وائے من آں عاشق ہر رنج و ملالم	گر پیک اجل آمدہ پیغام وصالم
مقصود مرا نیست بجز مہرِ تو دیگر	زنہار نہ بد غیرِ وصال تو سوالم

اے صبر منم توگل گلزار معانی

در گلشن ایجاد کجا ہست مثالم

ان اشعار سے صبر آروی کی زبان دانی، مشق شعری اور پختگیٔ فن کا اندازہ ہوتا ہے، معمولی بساط کا آدمی کریما سعدی کا جواب اسی رنگ و انداز میں لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا، میں قدرے اختصار کے ساتھ ذیل میں کریما اور رحیما سے ہمعنوان اشعار کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کرتا ہوں جسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ صبر آروی کی طرح بہت قبل کسی اور زیادہ کہنہ مشق، پُرگو اور صاحب زبان و بیان شاعر نے پند سعدی کی پیروی میں کریما لکھ کر سعدی سے منسوب کر دی ہے، یا سعدی تخلص کا کوئی دوسرا شاعر مشق سخن کا یہ انمول نمونہ زیبِ قرطاس کر کے خود پردۂ گمنامی میں روپوش ہو گیا، ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

کریما	رحیما
کریما ببخشائے بر حالِ ما	رحیما بحالم بشو مہرباں
کہ ہستم اسیر کمند ہوا	کہ تنگ آمدم از جفائے جہاں
نداریم غیر از تو فریاد رس	بلطف تو می باشم امیدوار
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس	کہ من جرم پیشہ تو آمرزگار
زباں تا بود در دہاں جائے گیر	رقم چوں کنم نعتِ خیر الوریٰ
ثنائے محمدؐ بود دلپذیر	چو وصفش کند خالق دوسرا
حبیبِ خدا اشرفِ انبیاء	دلے ناتواں دم بوصفش زنم

کریما	رحیما
کہ عرش مجیدش بود متکا	ازو تا بہ معراج رفعت رسم
چہل سال عمر عزیزت گذشت	بدام جہالت اسیری بدام
مزاجِ تو از حال طفلی نگشت	سرت پر غرور از ....
ہمہ با ہوا و ہوس ساختی	ازیں ہرزہ گردی چہ گردد حصول
دمے با مصالح نہ پرداختی	بزن گام اے دل براہ رسولؐ
مکن تکیہ بر عمر ناپائیدار	گنجِ نشر اوانِ گیتی مناز
مباش ایمن از بازیٔ روزگار	کہ ناسازگار است ایں برگ و ساز
کرم مایۂ شادمانی بود	کرم مرد را ارجمندی دہد
کرم حاصل زندگانی بود	رسائی بہ بام بلندی دہد
سخاوت کند نیکبخت اختیار	طریق سخا ہر کہ کرد اختیار
کہ مرد از سخاوت شود بختیار	بملک سعادت شدہ شہریار
بخیل ار بود زاہد بحر و بر	بخالت فرومی بردنیک نام
بہشتی نباشد بحکم خبر	بیندازد از جنت لاکلام
تواضع کند مرد را سرفراز	بزرگ از تواضع ندارد دریغ
تواضع بود سروراں را طراز	فرو ریزد از آب پر شد چو میغ
تواضع کلید در جنت است	تواضع رساند بجنت ترا
سرافرازی و جاہ را زینت است	کزو خوش شود نیز از تو خدا
تکبر عزازیل را خوار کرد	چوں قاروں تکبر مکن زینہار
بزندانِ لعنت گرفتار کرد	مشو غافل از گردشِ روزگار

کریما	رحیما
تکبر بود عادتِ جاہلاں	باموال جاہل تکبر کند
تکبر نیاید ز صاحبِ دلاں	خرد از تکبر تنفر کند
چو شمع از پئے علم باید گداخت	ہر آں کو کہ از علم شد ہوشیار
کہ بے علم نتواں خدارا شناخت	تواں یافت او را ز پروردگار
ترا علم در دین و دنیا تمام	مددگار تو علم باشد مدام
کہ کار تو از علم گیرد نظام	بدست آید از غیب مقصد مدام
ترا اژدہا گر بود یار غار	ہمردم ترا صحبت کور و لنگ
ازاں بہ کہ جاہل بود غمگسار	ترا دوستی بہ ز گرگ و پلنگ
اگر خصم جان تو عاقل بود	یکے باخرد داری گر دوستدار
بہ از دوست دارے کہ جاہل بود	ازاں بہ کہ جاہل بود صد ہزار
رعایت دریغ از رعیت مدار	بدہ داد مظلوم لیل و نہار
مرادِ دلِ دادخواہاں بر آر	ستم بر رعیت مکن زینہار
ستم بر ضعیفان مسکین مکن	مشو راغب ظلم اے ذی خرد
کہ ظالم بہ دوزخ رود بے سخن	کہ ظلمت ترا سوئے دوزخ برد
دلا گر قناعت بدست آوری	بہ قسمت کند گر قناعت کسے
در اقلیم راحت کنی سروری	بدست آیدش شادمانی بسے
مکن عمر ضایع بہ تحصیل مال	بود حرص در دہر وجہ ملال
کہ ہم نرخ گوہر نہ باشد سفال	مشو در جہاں بہر زر خستہ حال
بآب عبادت وضو تازہ دار	عبادت شود حسن افزائے تو

کریما	رحیما
کہ فردا از آتش شوی رستگار	بود در بہشت بریں جائے تو
کسے را کہ شیطاں بود پیشوا	مکن گوش آواز ابلیس را
کجا باز گردد براہ خدا	کہ آدمی رساند بقہر خدا
بدہ ساقیا آب آتش لباس	بدہ ساقیا بادۂ مشکبو
کہ مستی کند اہل دل التماس	کہ سازم گزو ہمچو رنداں وضو
بیار آں شراب چو آب حیات	مئے عشق در دل سرورے دہد
کہ یابد ز بویش دل از غم نجات	برد رنج و در چشم نورے دہد
مگرداں ز کوئے وفا روئے دل	بچشم حقیقت شوی بس خجل
کہ در روئے جاناں نباشی خجل	نشان وفا گر نداری بدل
نفس جز بشکر خدا بر میار	زباں را سپاس خدا می سزد
کہ واجب بود شکر پروردگار	کہ جز ناسپاسی نہ کاریست بد
صبوری ترا کامگاری دہد	بمطلوب خود از صبوری رسی
ز رنج و بلا رستگاری دہد	صبوری دہد دست بر بے کسی
بہ از راستی در جہاں کار نیست	چہ خوش گفتہ اند ایں خرد پروراں
کہ در گلبن راستی خار نیست	بہ از راستی کار دیگر مداں
دروغ اے برادر مگو زینہار	"ز ناراستی نیست کار بتر"
کہ کاذب بود خوار و بے اعتبار	ازوے کنند اہلِ دانش حذر
ز ناراستی نیست کارے بتر	مگو کذب زنہار اے ہوشمند
ازو گم شود نام نیک اے پسر	کہ باشد رساند ترا صد گزند

نگہ کن بریں گنبدِ زرنگار
کہ سقفش بود بے ستون استوار
سراپردۂ چرخ گردندہ بیں
درو شمعہاے فروزندہ بیں
یکے شادمان و یکے دردمند
یکے کامران و یکے مستمند
یکے بر حصیر و یکے بر سریر
یکے در پلاس و یکے در حریر
یکے نیک کردار و نیک اعتقاد
یکے غرق در بحرِ فسق و فساد

سوئے چرخ از چشمِ عبرت نگر
کہ چون ست تابندہ درو ے قمر
گہرہاے انجم پریشاں درو
مہ و مہر و ناہید تاباں درو
یکے بے نوا و یکے مستمند
"یکے شادمان و یکے دردمند"
چو گل از طرب و شاد و خنداں یکے
چو شبنم دریں باغ گریاں یکے
یکے سالکِ جادۂ اتقا
یکے رہروِ راہِ کفر و ابا

ازیں پس مکن تکیہ بر روزگار
کہ ناگہ زجانت بر آرد دمار
مکن تکیہ بر لشکرِ بے عدد
کہ شاید ز نصرت نیابی مدد
ثباتے ندارد جہاں اے پسر
بغفلت مبر عمر در وے بسر

پس آنگہ مکن اعتبارِ زماں
کہ ہر دم دگرگوں شود ایں جہاں
مکن تکیہ بر دولتِ بے بقا
کہ مضمر شود در بقایش فنا
دریغا کہ از دورِ گردوں دوں
نشانے کز وشاں نہ بینی کنوں

ہرچند کریما کے اشعار جس سادگی و برجستگی، تازگی و شگفتگی، ایجاز و اختصار، لفظی آب و تاب اور پرِش فکر و خیال کے حامل ہیں وہ رحیما میں اس حد تک نہیں، تاہم اگر رحیما کے اشعار کریما کے اشعار میں ملا کر پیش کئے جائیں تو ایک ناواقف کے لئے تمیز

مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوگی۔ نقل سبک و پیروئ اسلوب کی اتنی کامیاب مثال جو صبر آزری کی تلمی و شعری مہارت پر دال ہے، بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

بہرحال اب تک کریما شیخ سعدی شیرازی سے ہی منسوب رہی ہے اور ان اشعار گراں مایہ کا کوئی دوسرا مدعی کسی عہد میں نہ ہوا، لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ بعض اوقات کسی شاعر کا کچھ کلام اگرچہ اس کے کہن ترین نسخوں میں نہیں ملتا مگر حقیقۃً اسی کے فکر و خیال کا ثمرہ ہوتا ہے اور کسی نہ کسی طرح عوام میں مقبول ہو کر محفوظ رہ جاتا ہے، مثلاً حضرت امیر خسروؒ کی یہ غزل ع نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم ان کے کسی دیوان میں نہیں ملتی مگر بجا طور پر انہیں سے منسوب ہے، یا پھر حضرت قدسی کی مشہور زمانہ نعت ع مرحبا سید مکی مدنی العربی، جسے آج تک قدسی کے علاوہ کسی دوسرے کی نسبت نہ دی جا سکی، اسی طرح کریما بھی سعدیؒ کے قدیم کلیات میں شامل نہ ہو سکی اور جداگانہ کتابی شکل میں محفوظ رہ گئی، شبہہ بہرحال شبہہ ہے تا آنکہ کوئی بین ثبوت فراہم نہ ہو اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

اگر مشک خالص نداری مگوئی ورت ہست خود فاش گردد بوئی

میرے اس خیال کو صاحب "قلمرو سعدی" کی درج ذیل تحریر سے مزید تقویت پہنچتی ہے، "قلمرو سعدی" میں آقائے علی دشتی 'باب اول سخن از سعدی' کے تحت باوجود اپنے تفحص و تحقیق و جستجو کے اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ

"متاسفانہ دربارۂ سعدی چنیں تحقیقاتے صورت نگرفتہ و از زندگانی وے در آوان جوانی و پس ازاں در دورۂ اقامت بغداد و تحصیل در مدرسہ نظامیہ و مسافرتہاے وے در بلاد اسلامی و کیفیت زندگانی او طے سی سالی کہ در کشورہاے عربی بسر بردہ است چیز قابلے در دست نیست۔" (ص ۲۵)

کیا عجب کریما سعدی کے انہی ایام کی تصنیف ہو اور اہل ایران اس سے واقف نہ ہو سکے۔

مرمی نہند پیش خطت عارفان فارس بیتے مگر ز گفتۂ سعدی نوشتہ ای

حافظ سخاوی کی تصانیف

از

منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین

امام سخاوی کے حالات دو نمبروں میں پہلے چھپے تھے، اس نمبر میں ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے (م، ن)

حافظ سخاوی نے اپنی طویل علمی زندگی میں مختلف علوم و فنون پر بکثرت کتابیں لکھیں، ان کی تصانیف کا دائرہ یوں تو بڑا وسیع ہے، لیکن تاریخ و سیرت اور علوم حدیث میں ان کا قلم بڑا ثمر ریز رہا ہے، مگر ان کی تصانیف کو ان کے استاذ ابن حجر کی سی شہرت نصیب نہ ہوئی، تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے ساتھ زیادہ اعتنا نہیں کیا، اس لئے کم ہی کتابوں کو رواج عام حاصل ہو سکا، باقی یا تو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں یا مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت ہیں۔

زرکلی نے ان کی تصانیف کی تعداد دو سو[۲۰۰] سے متجاوز بتائی ہے[۱]۔

فتح المغیث کے خاتمہ پر یہ الفاظ ملتے ہیں:

ولہ تصانیف تزید علی اربعة مائة مجلد[۲]	ان کی چار سو سے زیادہ تصنیفات ہیں۔

صاحب النور السافر نے سخاوی کی کچھ کتابوں کے نام گنائے ہیں[۳]۔

---

۱ الاعلام ۳، ۹۱۶ ۲ فتح المغیث ۵۰۲ ۳ النور السافر ۱۹۔

ممکن ہے الاعلام اور فتح المغیث کے بیان کو مبالغہ پر محمول کیا جائے، لیکن سخاوی نے اپنے حالات کے ضمن میں جن کتابوں کی نشان دہی کی ہے، ان میں ایک سو چوبیس نام ملتے ہیں[۱]۔

الضوء اللامع ان کی کتابوں میں الضوء اللامع کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس ضخیم کتاب میں انھوں نے نویں صدی کے حالات بیان کئے ہیں، معلومات کی کثرت اور مضامین کے تنوع کی بنا پر اسے قبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہوئی، اس کتاب میں اس عہد کی علمی کوششوں اور فنی ترقیوں کے ساتھ گیارہ ہزار سات سو بتیس[۱۱۷۳۲] علماء کے سوانح حیات اور علمی کارنامے بیان کئے گئے ہیں، گیارہ جلدیں اساتذہ، شیوخ، ممتاز اشخاص، ادبا، شعراء اور معاصرین کے حالات پر مشتمل ہیں، اور بارہویں جلد میں ذی علم اور صاحب نظر خواتین کا تذکرہ ہے، ان میں بہت سی فن حدیث کی ماہر، سیر و سوانح کی عالم اور تعلیم و تدریس میں خاص امتیاز رکھتی ہیں، تذکرہ و تراجم کے باب میں سخاوی کی یہ ضخیم کتاب ماخذ و سند کا درجہ رکھتی ہے، یہی وجہ ہے اس کی بعض خامیوں کے باوجود علماء اور ارباب نظر نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے، اور سخاوی کی وسعت نظر، ژرف نگاہی کی دل کھول کر داد دی ہے۔

علامہ شوکانی نے لکھا ہے "اگر سخاوی کی الضوء اللامع کے سوا کوئی اور تصنیف یادگار نہ ہوتی تب بھی یہ کتاب ان کی جلالت شان اور امامت فن کا بین ثبوت ہوتی، اس کتاب میں انھوں نے اپنے دور کی دنیائے اسلام کے مایہ ناز اشخاص کے حالات، ان کے اساتذہ، تصانیف اور تواریخ مولد و وفات کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے، جس سے ان کے علم، وسعت نظر اور لوگوں کے حالات سے گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے[۲]":

امام لغت و ادب علامہ مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ

"سخاوی نے اپنی کتاب میں اپنے حالات بڑی خوبی کے ساتھ لکھے ہیں، وہ ان مایہ ناز شخصیتوں

---

۱ فوائد جامعہ: ۳۰۵ تا ۳۰۸ ۲ البدر الطالع ۲: ۱۸۶۔

مند سے ہیں، جن کی تصانیف سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے[1]۔

البتہ سخاوی پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ وہ معاصرین کے کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھے، اسی سبب سے انھوں نے اپنے اساتذہ اور تلامذہ کے علاوہ کسی معاصر کا اچھے انداز میں تذکرہ نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے اس کا شکوہ کیا ہے، صاحب بدائع الزہور کہتے ہیں:

"حافظ سخاوی بہت بڑے عالم تھے، وہ حدیث و تاریخ پر عبور کامل رکھتے تھے مگر انھوں نے ایک تاریخ کی کتاب لکھی جس میں لوگوں کی بڑی برائیاں کی ہیں[2]"۔

شوکانی رقمطراز ہیں:

"سخاوی اگرچہ بالاتفاق امامت کے درجہ پر فائز ہیں، لیکن وہ اکابر معاصرین سے تعصب رکھتے تھے، جو بھی ان کی کتاب "الضوء اللامع" کا مطالعہ کرے گا، اس کا اندازہ کرلے گا، اکثر معاصرین ان کی تنقید و تنقیص سے نہیں بچ سکے ہیں، البتہ اپنے اساتذہ و تلامذہ کا تذکرہ بڑے پُروقار انداز میں کرتے ہیں[3]:

شیخ محمد بن خضیری کے حالات میں لکھا ہے:

"سخاوی نے ان کے حالات اگرچہ تفصیل سے لکھے ہیں مگر معاصرین کے معاملہ میں اپنی عادت کے مطابق سب و شتم سے کام لیا ہے[4]"۔

سخاوی کے تذکرہ میں شوکانی نے بڑے دلگیر انداز میں تحریر کیا ہے:

"کاش سخاوی نے اپنی کتاب کو اپنے ہمسر اکابر علماء کی عیب چینی سے محفوظ رکھا ہوتا[5]"

---

[1] تاج العروس ۱۰، ۱۸۲ [2] بدائع الزہور فی وقائع الدہور ۳، ۳۲۱ [3] البدر الطالع ۱، ۳۳۴

[4] ایضاً، ۳۵۵ [5] ایضاً جلد ۱: ۱۸۴

مگر یہ اعتراض کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا ہے، کیونکہ سخاوی نے یگانۂ روزگار فضلاء سے کسب فیض کیا تھا، تحصیل علم کے لئے انھوں نے دور دراز مقامات کا سفر کیا تھا اور مدتوں قاہرہ و حرمین میں افادہ و استفادہ کی غرض سے مقیم رہے، اس سیاحت علمی سے ان کے ذہن و دماغ کے دریچے وا ہوئے، علم میں پختگی، فکر میں استحکام اور شاہدہ میں گہرائی پیدا ہوئی، اس بنا پر وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے، جب انھوں نے سیر و سوانح پر قلم اٹھایا تو بڑی سے بڑی شخصیت کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھا اور ہر ایک کے علم و عمل کے جائزہ میں تکلف نہیں کیا، مگر حتی الامکان جادۂ اعتدال سے انحراف نہیں کیا، رہا معاصرانہ اختلافات کا سوال تو افراط و تفریط کا دونوں فریق شکار ہوئے، وہ دور علوم و فنون کے ارتقاء کا تھا، اس لئے معاصرت بھی شباب پر تھی، شخصیت کا بے لاگ جائزہ لینا خوبی ہے، خامی نہیں، پھر سخاوی نے معاصرین پر جو رائے دی ہے اس میں توازن کو نظر انداز نہیں کیا ہے، معاصرین کی خدمات کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے، لیکن جو خامیاں نظر آئیں ان کو بے جھجک بیان کر دیا ہے۔

سخاوی پر جانبداری کا الزام اس لئے بھی زیب نہیں دیتا کہ انھوں نے اپنے محبوب استاد ابن حجر پر بھی گرفت کی ہے، انھوں نے عقیدت و محبت سے الگ ہو کر علمی انداز میں ان پر تنقید کی، علامہ زاہد کوثری کو شکایت ہے کہ "ابن حجر نے الدرر الکامنہ میں احناف سے تعصب برتا ہے" اور حافظ سخاوی کے حواشی کو شہادت میں پیش کیا[1]۔

شیخ حسام الدین حنفی (المتوفی سنہ ۷۱۱ھ) کا تذکرہ الدرر الکامنہ میں ابن حجر نے نظر انداز کر دیا تھا، سخاوی نے استاد کی اس روش پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور حاشیہ میں اپنی طرف سے ان کے حالات لکھ دیئے[2]۔

---

[1] حاشیہ نصب الرایہ ۱، ۶۰ [2] بحوالہ انوار الباری: ۱۴۶۔

علامہ کوثری کے علاوہ دوسرے حنفی علماء نے بھی سخاوی کے اس رویہ کو پسند کیا ہے[۱]۔

الضوء اللامع کے ناشر شیخ حسام الدین القدسی کی رائے ہے کہ

"یہ کتاب قرون وسطیٰ کے علمی کارناموں کی تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک بیش بہا خزانہ، اور مورخین کے لئے معلومات کا بڑا قابل اعتماد ذریعہ ہے، اس کتاب میں سخاوی نے پہلے آٹھویں صدی کے ان اشخاص کا ذکر کیا ہے جو ان کے استاد حافظ ابن حجر سے چھوٹ گئے تھے پھر خود نویں صدی کے قابل ذکر اشخاص و خواتین کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، ان میں وہ بھی ہیں جو نویں صدی میں وفات پاگئے اور وہ بھی ہیں جو دسویں صدی تک زندہ رہے، یہ تمام تراجم ایک غیر جانبدار ناقد کی نظر سے انھوں نے لکھے ہیں[۲]۔"

ایک اشکال اور جواب | نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے لکھا ہے کہ "امام شوکانی نے سخاوی کی کتاب الضوء اللامع کو ابن حجر کی کتاب الدرر الکامنہ پر ترجیح دی ہے[۳]۔"

شوکانی نے خود لکھا ہے کہ "ان دونوں کتابوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے[۴]"۔ بعض اعتبارات سے بات صحیح ہے، مگر دونوں کے میدان الگ الگ ہیں، ابن حجر نے آٹھویں صدی کے علماء، اساتذہ اور سلاطین و امراء کے حالات لکھے ہیں، جن کی تعداد چار ہزار پانسو (۴۵۰۰) ہے، انھوں نے ۸۳۲ھ میں اس کتاب کو پورا کرلیا تھا، پھر اس کے بعد ۸۳۷ھ تک اس میں اضافہ کرتے رہے لیکن آخر عمر تک اس کی تکمیل نہ کرسکے، بعد کو سخاوی نے نوسو (۹۰۰) ارباب کمال کے سوانح کا اضافہ کیا[۵]، اس طرح ابن حجر کی کتاب آٹھویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی۔

سخاوی کو طبقات و تراجم کی کتاب لکھنے کا خیال غالباً ابن حجر کی اس کتاب کو دیکھ کر آیا،

۱؎ بحوالہ انوار الباری : ۱۵۹ ۲؎ کلمۃ الناشر الضوء اللامع اول ۳؎ التاج المکلل : ۳۰۳

۴؎ البدر الطالع ۲ : ۱۸۹ ۵؎ الدرر الکامنہ ۴ : ۵۰۲

انھوں نے نویں صدی ہجری پر قلم اٹھایا تو بارہ (۱۲) جلدوں کی ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی، اس سے ابن حجر کے کارنامہ کی تنقیص نہیں ہوتی، وہ آٹھویں صدی سے متعلق سیر و سوانح کا مستند سرمایہ ہے، اور سخاوی کا کارنامہ نویں صدی سے متعلق ہے۔ ابن حجر کی کتاب نقش اول کا درجہ رکھتی ہے اور سخاوی کی کتاب نقش ثانی کا، ابن حجر کی کتاب کی اشاعت دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جانب سے ۱۳۴۸ھ اور سخاوی کی الضوء اللامع مکتبۃ القدسی کی طرف سے ۱۳۳۵ھ میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

مختصرات | الضوء اللامع کی ضخامت کی وجہ سے بہت سے اہل علم نے اس کا اختصار بھی کیا ہے، ان میں ابن عبد السلام (المتوفی ۹۳۱ھ) کی البدر الطالع، شیخ احمد قسطلانی کی "النور الساطع" اور شیخ زین الدین عمر بن احمد الشجاع الحلبی (المتوفی ۹۳۶ھ) کی القبس الحاوی لغرر ضوء السخاوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، البدر الطالع اور القبس الحاوی کے نسخے مدینہ منورہ کے کتب خانہ عارف حکمت بے میں موجود ہیں۔ (الاعلام جلد ۱ ص ۱۷۱، مقالات سلیمان دوم ص ۲۰۴، کشف الظنون ۲/۸۵)

اس کے علاوہ سخاوی نے مالکی و شافعی علماء، اپنے معاصرین اور متعدد نامور اہل علم کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں، لیکن ابھی ان میں سے کوئی کتاب چھپی نہیں ہے، اس لئے سردست ہم انھیں نظر انداز کرکے صرف ان کتابوں کے متعلق لکھ رہے ہیں جو شائع ہوچکی ہیں۔

۲۔ فتح المغیث | "الفیۃ مصطلح الحدیث" امام زین الدین العراقی کی اصول حدیث پر مشہور و مقبول کتاب ہے، اس کا سن تالیف ۷۶۸ھ ہے، الفیہ کے بارے میں صاحب معجم کا بیان ہے "طارت صیتھا فی الآفاق" اس کی مفصل شرح حافظ سخاوی نے "فتح المغیث لشرح الفیۃ الحدیث" کے نام سے لکھی، جو اصول و مصطلحات حدیث کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے، صاحب کشف الظنون نے سہو قلم سے اسے عراقی کی تصنیف قرار دیا ہے،

۱۳۰۳ھ میں لکھنؤ سے بڑے سائز پر ۵۰۲ صفحات پر شائع ہوئی، صاحب شذرات الذہب کی رائے ہے کہ "اصول حدیث پر اس سے زیادہ جامع و نافع کوئی اور کتاب نہیں ہے"[1]، خود سخاوی کو اپنی اس شرح پر بڑا ناز تھا، لکھتے ہیں :

"فتح المغیث ایک مختصر کتاب (الفیۃ الحدیث) کی شرح ہونے کے باوجود ایک ضخیم کتاب بن گئی، اس میں متن کتاب کو نہایت خوبی کے ساتھ جدید طرز پر حل کیا گیا ہے، جو بھی اس کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ اس فن میں اس سے زیادہ جامع اور محققانہ کتاب کوئی اور نہیں ہے"[2].

محدثین اور علمائے اصول نے اس شرح کے ساتھ خاص اعتنا کیا اور اس کی بنا پر حدیث اور اصول حدیث میں سخاوی کی وسعت نظر کا اعتراف کیا ہے، طباعت کی غلطی سے النور السافر میں اس کا نام فسخ المغیث[3] غلط درج ہو گیا ہے۔

اس شرح کے علاوہ سخاوی نے حدیث و متعلقات حدیث پر اور تالیفات بھی کی ہیں، جن میں زیادہ مشہور شرح التقریب للنووی، بلوغ الامل تلخیص کتاب الدارقطنی فی العلل، اقرب الوسائل بشرح الشمائل للترمذی، الاحادیث المتباینۃ المتون والاسانید، القول المفید فی شرح العمدۃ لابن دقیق العید[4]، لیکن یہ سب ہمارے دسترس سے باہر ہیں۔

الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ | یہ کتاب بھی سخاوی کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس میں پہلے علم تاریخ کی تعریف اور اس کا موضوع بیان کیا ہے، پھر مختلف قسم کی تاریخی کتابوں کی فہرست گنائی ہے، جس سے اس عہد تک کی تاریخی تصانیف سے واقفیت ہو جاتی ہے، اس کے مطالعہ سے

[1] شذرات الذہب ۸ : ۱۶ [2] الضوء اللامع ۸ : ۱۶ [3] النور السافر : ۱۹

[4] البدر الطالع ۲ : ۱۸۵ و فوائد جامعہ : ۴۰۹ .

معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نویسی کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس پر مسلمان مورخین نے قلم نہ اٹھایا ہو، شذرات الذہب میں اس کتاب کا نام "الاعلان بالتوبیخ علی من ذم علم التوریخ" درج ہے[1]، اس کتاب کے بارے میں صاحب شذرات الذہب نے لکھا ہے: "ھو نفیس جداً"[2] مرحوم حماد پاشا تیمور نے لکھا ہے "تاریخ اسلام کی تاریخ پر یہ کتاب لاجواب ہے"[3]، مکتبہ قدسی دمشق سے یہ کتاب ۱۳۴۹ھ میں شائع ہو کر ارباب فضل و کمال سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے، اس کا جدید ایڈیشن نیز انگریزی ترجمہ از روز نتھال اور اردو ترجمہ از سید محمد یوسف مع حواشی مفیدہ طبع ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ سخاوی نے تاریخی موضوع پر "تاریخ المدنیتین"، "التاریخ المحیط" اور "التذکرۃ" جیسی ضخیم کتابیں تالیف کیں، ان کے علاوہ بعض تاریخی کتابوں کی تلخیص بھی کی، جن میں زیادہ مشہور تلخیص تاریخ الیمن، منتقی تاریخ مکہ للفاسی اور تلخیص طبقات الشعراء لابن الجزری وغیرہ۔

المقاصد الحسنۃ | اس کا پورا نام المقاصد الحسنۃ فی بیان کثیر من الاحادیث المشتہرۃ علی الالسنۃ[4] ہے، یہ موضوع بڑا نازک تھا، لیکن سخاوی نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے اس کا حق ادا کر دیا ہے، اس کتاب سے حدیث و رجال میں سخاوی کا کمال واضح ہوتا ہے، سیوطی نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا لیکن مورخ ابن العماد حنبلی (المتوفی ۱۰۸۹ھ) کا فیصلہ ہے کہ :

هو اجمع واتقن من كتاب
السيوطي المسمّى بالجواهر
المنتثره في الاحاديث المشتهره
وفي كل منهما ماليس في الآخر[5]

مقاصد حسنہ علامہ سیوطی کی کتاب جواہر منتثرہ سے زیادہ جامع اور بہتر ہے، لیکن ہر ایک میں معلومات ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔

[1] شذرات الذہب ۸ : ۱۶ [2] الاعلان بالتوبیخ ۱ [3] دائرہ معارف اسلامیہ اردو جلد ۱۱ ص ۶۲ [4] احادیث مشتہرہ سے مراد وہ احادیث ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں، لیکن مستند اور قابل اعتماد نہیں ہیں [5] شذرات الذہب ۸ : ۱۶

صاحب الرسالۃ المستطرفۃ نے بھی اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے[1]

سخاوی کے شاگرد ابی الضیا، عبدالرحمٰن بن الربیع الشیبانی الشافعی (المتوفی ۹۴۴ھ) نے "تمییز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی الالسنۃ من الحدیث" کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے بعض لوگوں نے اس کا نام "الدرۃ اللامعۃ فی بیان کثیر من الاحادیث الشائعۃ" بیان کیا ہے[2]، اس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے، اس کی کتابت دو کاتبوں نے کی ہے، صفحۂ اول سے دو سو آٹھ (۲۰۸) تک خط بہت واضح اور عمدہ ہے، سنہ کتابت درج نہیں، لیکن نویں صدی کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے، صفحہ دو سو نو (۲۰۹) سے دو سو تیس (۲۳۰) تک معمولی خط ہے، سنہ کتابت ۸۷۰ھ مرقوم ہے[3] مقاصد حسنہ حروف تہجی پر مرتب کی گئی ہے، یہ ۱۹۵۶ء میں مصر، بغداد اور ہندوستان سے شائع ہو چکی ہے[4]

| القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع | یہ کتاب بھی سخاوی کے علم و فضل پر شاہد عدل ہے، اپنے موضوع پر یہ منفرد کتاب ہے، اس میں درود کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اس کا حکم، محل، نبی و رسول کا فرق، اسماء النبی، ازواج النبی، اوقات درود وغیرہ عنوانات سے بحث کی گئی ہے، ایک مقدمہ پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے، اس کی تالیف سے مصنف رمضان ۸۶۰ھ میں فارغ ہوئے تھے مگر بعد میں اضافے کرتے رہے[5]، اس کتاب کی زبان بہت ہی شستہ و رواں ہے اور لفظ لفظ سے عقیدت نمایاں ہے، یہ کتاب مصر و حیدرآباد کے علاوہ الہ آباد سے بھی ۱۳۲۱ھ میں شائع ہو چکی ہے۔

| التبر المسبوک | سخاوی نے مشاہیر اہل قلم کی شہرۂ آفاق کتابوں کو مکمل کرنے کی خاطر مفید ذیول

[1] الرسالۃ المستطرفۃ: ۱۵۵ [2] ایضاً: ۱۵۶ [3] نوادر خدا بخش لائبریری: ۹۲ [4] فن اسماء الرجال: ۱۰۶، [5] القول البدیع: ۲۰۱

لکھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور مقریزی کی "السلوک بمعرفۃ دول الملوک" کا ذیل "التبر المسبوک" ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود تذکرہ و تراجم کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے، اس کو سخاوی نے سنہ وار ترتیب دیا ہے، ۸۴۵ھ سے شروع کیا ہے اور نویں صدی کے آخر تک کے واقعات و حوادث لکھے ہیں، اس میں ان اکابر و اعیان کے حالات بھی لکھ دئے ہیں جو اس اثنا میں وفات پا گئے تھے، اپنے استاد حافظ ابن حجر کے حالات کے بیان میں بڑی شرح و بسط سے کام لیا ہے، بولاق مصر سے یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

| الجواہر والدرر | سخاوی نے الضوء اللامع، التبر المسبوک میں اپنے استاد و محسن علامہ ابن حجر کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن ان کے ساتھ ایسا جذباتی لگاؤ تھا کہ ان کے سوانح حیات کے لئے ایک الگ کتاب تصنیف کی[1]، یہ مخطوطہ کی شکل میں تھی، عرصہ ہوا ڈاکٹر مختار الدین آرزو اس کو ایڈٹ کرکے شائع کرنے والے تھے[2]، لیکن اب تک مطبوعہ حالت میں ہماری نظر سے نہیں گذری۔

| کچھ کتابوں کا مغالطہ | الاسماء النبویۃ، الصلوٰۃ علی النبی، موت الانبیاء وغیرہ متعدد کتابیں جو علامہ سیوطی کے نام منسوب ہیں، ان کے بارہ میں حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ یہ دراصل ان کی تصانیف ہیں، سیوطی نے ان میں کچھ حذف و اضافہ کیا ہے، مشہور ہے کہ قدماء کی متعدد کتابیں اسی طرح معمولی حذف و اضافہ سے ان کی طرف منسوب ہو گئی ہیں، اس سلسلہ میں مکتبہ محمودیہ[3] کی بعض کتابوں کا بھی

[1] النور السافر: ۱۹ [2] مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۶۳ء [3] یہ مشہور عالم و مورخ، حافظ حدیث برہان الدین بن جماعہ (المتوفی ۸۱۹ھ) کا ذاتی کتب خانہ تھا، اس کتب خانہ میں اس کا اہتمام تھا کہ مصنفین کے ہاتھ کی لکھی کتابیں اس میں موجود تھیں ان کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ وقف عام ہو گیا، یہ کتب خانہ ایک ہزار مجلدات پر مشتمل تھا، سخاوی نے الجواہر والدرر میں لکھا ہے کہ ۸۲۶ھ میں اس کتب خانہ کے ناظم فخر الدین طاغی کو کتب خانہ سے چار سو مجلدات کے خرد برد کرنے کے الزام میں معزول کر دیا گیا تو اس کا ناظم ابن حجر کو بنایا گیا اور وہ زندگی بھر

(اگلے صفحہ پر)

ذکر کیا جاتا ہے، اس وقت ہمارے پاس وہ کتابیں موجود نہیں ہیں، ورنہ مقابلہ کے بعد پتہ چلتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، ویسے متاخر متقدم سے اخذ و استفادہ کرتا ہی رہتا ہے، جیسا کہ قاضی شوکانی نے لکھا ہے: ہر متاخر متقدم کی کتابوں سے اخذ و انتخاب کرتا ہے، ان کا اختصار بھی کرتا ہے اور توضیح بھی، کبھی ان کی غلطیوں پر اعتراض کرتا ہے، یہ اور اسی قسم کی دوسری اغراض لے (متاخر) کو تصنیف و تالیف پر آمادہ کرتی ہے، بھلا ایسا کون مصنف ہے جو متقدمین کی کتابوں پر اعتماد کرتا ہو اور ان کی تصانیف سے اخذ و استفادہ نہ کرتا ہو[1] خود شوکانی نے بھی متقدمین کی کتابوں سے اس طرح کا فائدہ اٹھایا ہے، نیل الاوطار ان کی تصانیف میں شاہکار سمجھی جاتی ہے، نواب صدیق حسن خاں اس کی تعریف و توصیف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے، ان کے علاوہ اور بہت سے اہل علم اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن متقدمین کی کتابوں سے کافی مواد اس میں شامل ہے، مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ:

اعلم ان نیل الاوطار   نیل الاوطار چار کتابوں،
ماخوذ من اربعۃ کتب فتح الباری   فتح الباری، تلخیص الحبیر،
وتلخیص الحبیر ومجمع الزوائد   مجمع الزوائد اور شرح ترمذی
وشرح الترمذی للعراقی[2]   عراقی سے ماخوذ ہے۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) اس کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے" مقریزی الخطط والآثار میں اس کتب خانہ کے بارے میں لکھتے ہیں "دیار مصر و شام میں آج اس جیسا کوئی کتب خانہ نہیں ہے" ۹۲۳ھ میں جب سلطان سلیم عثمانی نے مصر فتح کیا تو اس کی اکثر کتابیں استنبول منتقل کر دی گئیں۔ [1] البدر الطالع ۱ : ۲۳۳،

[2] فیض الباری اول : ۲۶۱۔

مسجدِ قُرطبہ
فکری و فنی حیثیت سے

از

از جناب سید محمد ہاشم صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

مسجد قُرطبہ اقبال کی اعلیٰ ترین نظموں میں سے ایک ہے، یہ اُن کے فکر و فن کا نچوڑ ہے اس کے آئینہ میں ہم ان کے احساسات اور پیغامات کی تقریباً تمام پرچھائیاں دیکھ سکتے ہیں، شاعری میں اعجاز کی شان اُس وقت پیدا ہو جاتی ہے، جب فکر و فن ایک دوسرے میں، غم ہو جاتے ہیں مسجد قُرطبہ اس دور میں لکھی گئی، ہے، جب اقبال کی فکر فن میں ڈھل گئی تھی، اور فن میں فکر کی روح سرایت کر چکی تھی، انھیں اب اپنی فکر کے اظہار کے لئے کسی صناعی یا مینا کاری کی ضرورت نہیں تھی، یہ نظم اس زمانہ میں لکھی گئی تھی، جب اقبال نے کہا تھا، ع

میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو   فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

مری نوا میں ہے سوزِ خون و عہدِ شباب   ہوائے قُرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا

اس نظم کو پڑھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اگر صرف یہی نظم لکھتے تو بھی اُن کا شمار بڑے شعراء میں ہوتا، بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

"مسجد قرطبہ جدید اردو ادب کا شاہکار ہے، اس میں شاعر نے ایمائی اثر آفرینی سے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے، اس میں آرٹ، تاریخ اور فلسفہ ایسی خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ انسانی ذہن لطف اندوز ہوتا ہے، اور داد دیتا ہے۔"

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایشیا میں تڑپتے مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ سے اقبال کے دل و دماغ میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا تھا، اس وقت کوئی اسلامی سلطنت آزاد نہیں تھی، پھر جب انقلابات رونما ہونے شروع ہوئے، اور ایشیا کے سر پر ناامیدی و مایوسی کے منڈلاتے ہوئے بادلوں میں شگاف پیدا ہوا تو اقبال کے دل میں بھی امید کی ایک کرن پھوٹی ع روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب

دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر، اقبال نے مسجد قرطبہ کو دیکھا، اس سے بہت متاثر ہوئے، انھوں نے محسوس کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی عظمت کی عبرت انگیز کہانی ہے، اس لئے کہ یہ اور اس کے بنانے والے عالمی تہذیب کے امام تھے، انھوں نے یورپ کی تاریک راتوں میں علم کی مشعلیں روشن کیں، انھوں نے اپنی پاک بینی سے شرق و غرب کی تربیت کی، بادشاہت کو فقر کا ماتحت بنا کر ایک نئے انداز سے دل کی دنیا پر حکومت کرنا سکھایا وغیرہ، اور آج یہ عالم ہے کہ اُن کا کوئی پرسان حال نہیں، تقریباً سات سو سال سے مسجد قرطبہ اپنی عظمت رفتہ کی داستان زبانِ حال سے سُنا رہی ہے، اور زمانے کے تمام نشیب و فراز کو ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہی ہے،

اقبال مسجد قوت الاسلام یا تاج محل وغیرہ پر کوئی نظم لکھ سکتے تھے، لیکن جن افکار و خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے، اُن کے لئے یہ عمارتیں ناکافی تھیں، مسجد قرطبہ میں ان کے سب ہی بنیادی تصورات پوری جامعیت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، اس میں ان زمان و مکان، مردِ مومن اور خودی کے تصورات کے ساتھ عشق، حسن، فن اور تاریخ کے نظریات موجود ہیں، اس میں "شکوہ" کا جذبہ "خضر راہ" کی فکر، اور "طلوعِ اسلام" کا اضطراب بھی ملتا ہے،

مسجد قُرطبہ اقبال کے سامنے فنِ تعمیر کے ایک بے مثال نمونے کی حیثیت میں ہی نہیں آتی بلکہ اس میں اسلامی تہذیب اور اس کی شان و شوکت کے ساتھ اس کے در و دیوار اور نقش و نگار میں ایک مثالی انسان کے اخلاق حسنہ، جلال، جمال، اخلاص، للّٰہیت، سادگی، بلند نظری، عالی ہمتی اور وسیع القلبی، وغیرہ کی تمام صفات، دکھائی دیں، "مسجد قرطبہ" آٹھ بندوں پر مشتمل نظم ہے، ہر بند میں آٹھ اشعار ہیں، ہر بند نئے تصور کے ساتھ شروع ہوتا ہے ختم ہونے سے پہلے خیالات کے لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ جاتا ہے، جو آئندہ شروع ہونے والے بند کے لئے پس منظر کا کام دیتا ہے، اقبال کی بہترین نظموں میں یہ رجحان ملتا ہے کہ اصل بات کہنے سے پہلے ایک مختصر جامع اور پر فریب پس منظر تیار کرتے ہیں، اور ایسی فضا آفرینی کرتے ہیں، کہ اصل مقصد چشمہ کی طرح خود بخود پھوٹ پڑتا ہے،

مسجدِ قرطبہ تخئیل کی نہایت بلندی سے شروع ہوتی ہے، وقت یا زمان کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ انتھک کوششوں کے باوجود اس کی اصلی نوعیت سمجھنے اور سمجھانے سے بڑے بڑے علماء قاصر رہے ہیں، افلاطون زمان کی حقیقت کا قائل نہ تھا، اشاعرہ نے زمان کو منفرد آنات کا ایک تواتر بتایا، نیوٹن کے نزدیک زمان ایسی شے ہے جو اپنے ہی اندر مساوی طور پر متحرک رہتا ہے، ملا باقر کا خیال ہے، کہ زمان عمل تخلیق کے ساتھ پیدا ہوتا ہے جس کی بدولت الوہیت الٰہی اپنے تخلیقی امکانات کا شمار کراتی ہے، محی الدین ابن عربی نے دہر کو اسمائے حسنیٰ میں شامل کیا ہے، قرآن نے زمان کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، اور زندگی کی مسلسل حرکات کا ایک آلہ بتایا ہے، "اپنی رحمت سے دن اور رات بنایا تاکہ رات میں آرام کرو اور دن کی زندگی کو حرکی بناؤ" ابن خلدون

تھے . . . پہلی بار قرآن حکیم کے مطابق یہ نظریہ مرتب کیا کہ زمان میں مسلسل حرکت کے لحاظ سے تاریخ ایک ایسی حرکت نہیں ہے، جس کی راہ پہلے سے مقرر شدہ ہو، بلکہ ایک ایسی حرکت ہے جو خالص تخلیقی ہو، برگساں زمان کو ۲ قسموں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک وہ جو شب و روز یا ماضی حال مستقبل میں اسیر ہے، اور دوسرا اس سے بالاتر ہے، اس کے نزدیک موثر زمان وہ زمان ہے جس کا عموماً ہمیں احساس ہوتا ہے، اور جس پر طوالت و اختصار کا اطلاق ہو سکتا ہے، در اصل یہ زمان مکانی ہے،

جن لوگوں نے بھی زمان کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ کسی نہ کسی حد تک نظریۂ قرآن سے ضرور متاثر ہیں، اقبال کے زمان کا سرچشمہ بھی قرآن ہے، انھوں نے فلسفہ اور سائنس کے جدید نظریات کی روشنی میں شاعرانہ انداز میں بڑے کمال کے ساتھ اس مسئلہ کو سلجھایا ہے، انھوں نے ابن خلدون کی طرح اس پر غور کیا، اور برگساں کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے آگے نکل گئے، ان کے پیغام کی کامیابی کا راز بڑی حد تک اس تصور میں مضمر ہے کہ زمان ایک حقیقت ہے، اور زندگی زمان میں مسلسل تغیر اور حرکت کا نام ہے، ان کا زمان بھی دو شکلوں میں ملتا ہے، ایک دائمی ہو مرد خدا کا عمل اسی سے منسلک ہے، عشق کی بدولت رنگ ثبات و دوام حاصل کر لیتا ہے، اور یہ ہے:

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اسے زمان ایزدی کے نام سے بھی یاد کیا ہے، جو شخص زمان ایزدی میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے اس میں صفات الٰہیہ پیدا ہو جاتی ہیں، اس زمان کی صفات حسب ذیل ہیں،

اے خوش آں روزی کہ از ایام نیست　　صبح او را نیمروز و شام نیست

روشن از نورش اگر گردد رواں　　صوت را چوں رنگ دیدن می تواں

غیب ہا از تاب او گردد حضور　　نوبت او لایزال و بے مرور

دوسرا زمان عارضی ہے، جو ماضی حال مستقبل میں محصور ہے، اسی میں شب و روز کا سلسلہ بنتا ہے، یہی در اصل نقش گر حادثات ہے، اسی میں خدائے تعالیٰ اپنی صفات کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی جھلک غالبؔ کے اس مطلع میں بھی ملتی ہے،

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

یہیں دنیا کے امتحان گاہ ہونے کا تصور ملتا ہے ع

اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت بھی اسی زمانے میں آتی ہے، بے ثباتی و فنا کا تصور بھی اسی سے وابستہ ہے، پہلے بند کے سب ہی اشعار اس کی مثالیں ہیں،

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر　　کار جہاں بے ثبات کار جہاں بے ثبات

اس زمان کو جاوید نامہ میں "تسلسلی زمان" کہا ہے، اسے روز بے سوز سے تعبیر کیا ہے، جس پر غالب آکر اور اس سے نجات حاصل کر کے شاعر زمان ایزدی کا طلبگار ہوتا ہے،

زمانے کی حقیقت پر بڑے فلسفیانہ انداز میں بحث کی ہے، اس کی اہمیت عظمت اور تقدس کو تسلیم کیا ہے، اسی لئے انھوں نے حدیث کا ترجمہ بھی پیش کیا کہ "زمانے کو برا مت کہو زمانہ میں خود ہوں"،

پوری نظم پر زمانے کا تصور حاوی نظر آتا ہے، سلسلۂ روز و شب کی تکرار سے شروع کر کے وقت کی کارفرمائیوں کا ایک تصور پیش کیا ہے، نظم لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں وقت کا تاثر شدت کے ساتھ موجود تھا، وقت کے آئینہ میں وہ پوری نظام تکوینی کا نظارہ کرتے ہیں، وقت کا ایک مہیب اور خوفناک تصور بھی ہے، یہ محلات کو کھنڈروں میں اور بیابانوں

کو شہروں میں بدلتا رہتا ہے، اور تخریب و تعمیر کی منزلوں سے گزر کر ہمیشہ ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ اس سفاک اور ظالم وقت کے سامنے تمام تدابیر و افعال بے حقیقت ہیں، وقت کی اس تاریکی میں صرف ایک چراغ جلا ہوا ملتا ہے، جو اس ساری ظلمت کو قطع کر کے اسے منور کرتا جاتا ہے، وہ عشق کا چراغ ہے جو مردِ مومن کے سینے میں جاگزیں ہے، اس مایوسی کے عالم میں جو چیزیں آنی و فانی نہ ہو کر باقی اور دائمی بن جاتی ہیں، ان کی بنیاد اقبال کے اس شعر پر ہے؛

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اللہ تعالیٰ نے اخلاق کی تعلیم بھی قرآن کے ذریعہ دی، جس کی کامل اطلاع رسولِ اکرمؐ نے کی، اسی لئے حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ کسی نے آپؐ سے معلوم کیا کہ حضورؐ کا اخلاق کیا تھا، ؟ آپؐ نے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا، قرآن ہی آپؐ کا اخلاق تھا، اقبال کا انسانِ کامل رسولِ اکرمؐ ہیں آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع کر کے انسان کامل بن سکتا ہے، انسان اپنے اندر عشقِ رسول سے خدا کا اخلاق اور خدا کی صفات پیدا کرے، تو اس کے ہر کام میں غیبی مدد شامل ہو جائے گی، وہ کام اس کا ذاتی نہیں رہے گا، بلکہ خدا کا ہو جائے گا، اسی لئے

ع:۔ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

مردِ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن کر لازوال ہو جاتا ہے، مردِ مومن خود لافانی ہوتا ہے کیونکہ اسے جس چیز سے جلا ملتی ہے، وہ عشق ہے ع

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ

اور یہ سرکش اور دیو قامت وقت جو سب کو اپنے پنجہ میں اسیر کئے ہوئے تھا، اپنی قہرمانی سے ہاتھ دھو کر خود عشق کا اسیر ہو جاتا ہے جو پوری کائنات پر محیط نظر آتا ہے، کیونکہ ع

عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

یہاں آ کر وقت کی حیثیت خطۂ ارض میں پھیلی ہوئی آگ کی ہو جاتی ہے، اور عشق سمندر بن کر اس پر غالب آ جاتا ہے،

اقبال کے یہاں عشق کا جامع اور ہمہ گیر تصور ہے، یہ ایک شدید اور گہرا جذبہ ہے، جو حقیقت کے ادراک کی رسائی کا ایک موثر وسیلہ ہے، یہ ایک قوتِ حیات ہے، جو تمام صلاحیتوں کو بیدار کر کے راہ میں حائل سب دشواریوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی مقصود تک پہنچ جاتی ہے، ذات کو علویت کے انتہائی مقامات تک پہنچانے، جوہرِ وجود یعنی خودی کو چمکانے اور استحکام بخشنے کے لئے جس شے کی ضرورت ہے، وہ عشق ہے، یہ وہ گرمی اور حرارت ہے جو اُسے بیدار رکھتی ہے، اور زندگی کا خیر مقدم کرتی ہے،

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

عشق ایسی فعال اور حیات آفریں ولولہ خیز قوت ہے، جو افراد اور قوموں میں زندگی کے تسلسل اور روانی کو قائم رکھتی ہے، زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے، اور زندگی کے امکانات کی امین و محافظ ہے، یہ عشق متصوفانہ عشق کی ضد ہے، یہ "پیوستن" نہیں "گسستن" ہے، سلاتا نہیں بیدار کرتا ہے، سکون نہیں تڑپ پیدا کرتا ہے، وصل سے گریز اور ہجر سے محبت کرتا ہے، یہی بے خطر ہو کر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے، یہی خودی کی تربیت کرتا ہے، اور مزاحم قوتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے، یہ عشق فقہ اسلامی کی تشریح و توضیح کرتا ہے، یہی قافلوں کا سالار ہے، اور ابن السبیل ہے،

ابن السبیل (مسافر) حرکت کی علامت ہے عشق بھی حرکت ہے، اور یہ عشق سب ہی کچھ ہے،

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

عشق دمِ جبرئیل بھی ہے، دلِ مصطفےٰ بھی ہے، خدا کا رسول اور خدا کا کلام بھی ہے،

اس کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہوتا، ع

عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

یہی وہ نور ہے جو حضرت آدمؑ کو دیا گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا اپنی اصلی منزل پر آکر ٹھہر گیا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ وغیرہ کو اسی نے امتحان میں کامیاب کرایا، اور خود فنا نہیں ہوا،

ایک اور نظم "عشق اور موت" میں موت دعویٰ کرتی ہے کہ میں سب پر غالب ہوں، سب کو نیست و نابود کر دیتی ہوں لیکن وہ نور جو نورِ مطلق کی آنکھ کا تارا ہے اس کے سامنے موت کو بھی موت ہے، اور یہ نور عشقِ الٰہی ہے، جو مردِ مومن کا سرمایۂ نشاط اور دائمی اثر کا حامل ہے؛

ع : عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

مردِ مومن کے ذریعہ سے ایک کارنامہ دو وجوہ سے لازوال بن جاتا ہے، ایک تو وجہ خاص عشق کی ہے، دوسری وجہ وہ بے حد خلوص اور محبت ہوتی ہے کسی فن کو عظیم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں خونِ جگر صرف کیا جائے، زندگی کی پوری دوڑ میں عموماً اور فنونِ لطیفہ میں خصوصاً اس کی ضرورت پڑتی ہے، اس کا اطلاق مصوری، سنگ تراشی تعمیر، شاعری اور موسیقی وغیرہ پر بھی ہوتا ہے، یہ فن کی تزئین اور استحکام کا سب سے بڑا وسیلہ ہے "مسجد قرطبہ" میں صرف دو اشعار ایسے ہیں جن سے اقبال کا نظریۂ فن سامنے آتا ہے لیکن یہ اس قدر جامع اور مبسوط ہیں کہ پورے نظریہ کی روح ان کے اندر سمٹ آئی ہے،

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اور خونِ جگر کے بغیر ہر عشق ناتمام اور ہر نغمہ سودائے خام ہے،

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

یہ قطرۂ خونِ جگر اگر پتھر جیسی سخت چیز پر بھی پڑ جائے تو وہ مضطرب ہو کر دل کی طرح دھڑکنے لگے،

قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے ہے صدا سوز و سرور و سرود

اقبال کی شاعری کی نشو و نما بھی اسی خونِ جگر سے ہوتی ہے۔

خونِ دل و جگر سے مری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

یہ قطرۂ خونِ جگر ہے کیا؟ اگر خونِ جگر اس سرخی کی علامت تسلیم کر لی جائے جو مسجد قرطبہ کے رنگ کی شکل میں جلوہ گر ہے، تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن در اصل خونِ جگر خلوص اور حقیقی جذبے کا دوسرا نام ہے، دل میں اس کی صداقت، اس کا حسن اور یقین و ایمان اپنی جگہ مستحکم کر لیتا ہے، تو ہر تکوینی عمل کا محرک بھی یہی حقیقی جذبہ ہو جاتا ہے،

یہ حقیقی خلوص اور شدید جذبہ صرف مردِ مومن کے دل میں ہوتا ہے، فن سے اس کے کارنامے لازوال بن جاتے ہیں، مسجد قرطبہ فنِ تعمیر کا بے نظیر نمونہ اسی لئے ہے کہ اس کے معماروں کا سوز و گداز اور خلوص اس میں شامل ہے، مردِ مومن عشق کی بدولت اپنی خودی کو پہچان کر اور خدا کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر فطرت کو تسخیر کرتا ہے، ایک نئی کائنات بنا کر خدا کی کائنات کو تکمیل بخشتا ہے،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں میرا ہے یا تیرا

اقبال کے نزدیک جس میں جلال و جمال پورے طور پر موجود ہوں وہی صاحبِ کمال ہے، ان کے یہاں جمال کی دلبری ساحری بن جاتی ہے اور اگر دلبری یا قاہری ہو تو پیغمبری بن جاتی ہے، اقبال کے نزدیک مسلمان کے عناصر ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں،

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال اپنے مردِ مومن میں بھی یہی اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کا مردِ مومن ساقیٔ اربابِ ذوق، اور فارسِ میدانِ شوق ہوتا ہے، ایسے ہی صاحبانِ کمال کے ہاتھوں مسجد قرطبہ وجود میں آئی،

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

دوسرے اور تیسرے بند میں مندرجۂ بالا تصورات سمو دینے کے بعد چوتھے اور پانچویں بند میں مردِ مومن کی صفات کا شمار کراتے ہیں، وہ خلیفۃ اللہ ہے، اس کی زمین بے حدود اور افق بے ثغور ہوتا ہے، اس کا سوز و گداز اسے فرشتوں سے بلند کر دیتا ہے، اس انسانِ کامل کو دیکھ کر فرشتے دنگ رہ جاتے ہیں، ع

نوریاں بہ تماشائے خاکیاں مستمند

حضرت جبرئیلؑ بھی سوزِ آدم کے طلب گار ہیں۔

مرا راز و نیاز آدمے دہ — مرا سوز و گداز آدمے دہ

مومن عشق کے پروں سے اُڑ کر عشق کی وسعتوں سے آگے نکل جاتا ہے، مہ و پرویں اس کے نخچیر ہوتے ہیں، اور پکار اٹھتا ہے، کہ ع یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ کائنات کی ساری توانائی اس کے دم سے ہے، لیکن اقبال کا مردِ مومن نیٹشے کے فوق البشر سے مختلف ہے، فوق البشر خواہشات دنیاوی کا اسیر ہوتا ہے، لیکن مومن کامل خواہشات سے پاک اور اغراض سے بلند ہوتا ہے، اقبال مسجد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں،:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز

چھٹے بند میں اندلس کے عہدِ رفتہ (اُن کے شاندار دورِ اقتدار) کے ان مسلمانوں پر نظر جاتی ہے جنھوں نے ایمان و اخلاص کے ساتھ اس مسجد کو تعمیر کیا تھا، جسے اقبال حرم سے تشبیہ دیتے ہیں، اقبال کہتے ہیں کہ ان حاملینِ خلقِ عظیم نے یورپ پر غیر معمولی اثر ڈالا، آج بھی اندلس بلکہ سارے یورپ میں اسلامی اثرات نظر آتے ہیں، جس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، ان لوگوں نے قیصر و کسریٰ کی طرح شہنشاہی نہیں کی، بلکہ یہ ثابت کر دکھایا کہ ع

سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

آن مسلماناں کہ میری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اقبال ایسے مردانِ مومن کی تلاش میں ہے، وہ کہتا ہے

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے — عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

ساتویں بند میں عالمی انقلابات کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے، جرمنی، فرانس اور روم کے انقلابات کا ذکر کرتے ہوئے اس کی روح تڑپ اٹھتی ہے، اور اس کی زبان سے نکلتا ہے،

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

پھر کہتا ہے:-

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا — گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

آخری بند میں بھی دریائے کبیر کو مخاطب کر کے اس انقلاب کی پیشین گوئی کی ہے، جو ابھی پردۂ خفا میں ہے،:

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

پھر مسلمانوں کو ہر لحظہ سرگرم عمل رہنے کی تلقین کرنے کے بعد آخر میں اس شعر پر نظم تمام کردی ہے؛

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

فنی اعتبار سے یہ نظم نہایت چست اور Compect ہے، آٹھوں بند فطری زیر و بم کے حامل اور ابتدا و انتہا سے منسلک ہیں، ابتدا سے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک پرشور دریا کے کنارے کھڑا ہوا سلسلۂ روز و شب کی ٹکراتے موجوں کے تند تھپیڑوں کا مشاہدہ کررہا ہے، اور یہ بہاؤ اور روانی ہر مصرعہ کے ساتھ تیز تر ہوتی جاتی ہے، اس میں بلا کا مدوجزر ہے، الفاظ کے دروبست سے اس میں رجز کی موسیقی پیدا کی گئی ہے، ان میں غنائیت کے ساتھ ساتھ ٹھہراؤ بھی ہے لیکن اس سے روانی مقصود نہیں ہوتی، یہ ٹھہراؤ مقصد کو زیادہ موثر اور دلنشیں کردیتا ہے، مسجد قرطبہ کی بحر فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے، اس میں یہ ٹھہراؤ اپنے عروج پر ہے،

اس کی فنی صناعی اور فکری تعمیر کو اقبال نے خود مسجد قرطبہ کی صناعی اور حسن سے ہم آہنگ کردیا ہے، الفاظ کا انتخاب اس طرح کا ہے جیسے کوئی کاریگر ہر ہر پتھر کو مناسب جگہ پر پیوست کرتا چلا جارہا ہے،

وحدتِ تاثر اس کی بڑی خوبی ہے، افسانہ کی طرح نظم مختلف کلائمکس سے گذرتی اپنے منطقی منتہا کو پہونچتی معلوم ہوتی ہے، جس طرح افسانہ کے خاتمہ پر تشنگی کا احساس رہ جاتا ہے، اسی طرح اس نظم کے خاتمہ پر اچانک پن کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے،

ندرتِ اسلوب کے اعتبار سے یہ اقبال کی منفرد نظم ہے، اقبال کی کسی دوسری نظم کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہے جو مسجد قرطبہ کو حاصل ہے،

مولانا شبلیؒ کے ایک استاذ

مولانا محمد فیض اللہ مئوی

از مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مئوی مئو اعظم گڈھ

علامہ شبلی کے اساتذہ میں مولانا محمد فاروق چڑیاکوٹی، مولانا احمد علی سہارن پوری مولانا فیض الحسن سہارن پوری، اور مولانا ارشاد حسین رامپوری تو بہت مشہور ہیں، اور ان کے حالات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، لیکن علامہ مرحوم کے ایک اور باکمال استاد مولانا فیض اللہ پردۂ گمنامی میں مستور ہیں، ذیل کی سطور میں ان کے حالاتِ زندگی اور علمی و دینی مشاغل بیان کئے جارہے ہیں۔

پیدائش مولانا فیض اللہ صاحب اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو کے رہنے والے تھے، یہیں سنہ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) میں ان کی پیدائش ہوئی، والد کا نام حکیم یار محمد تھا، جو قصبہ اور اطراف و جوانب میں لایق طبیب سمجھے جاتے تھے، طبابت کے ساتھ وہ چھوٹے موٹے آپریشن بھی کر لیتے تھے۔

تعلیم و تربیت ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے جونپور مولانا سخاوت علی کے مدرسہ میں گئے، مولانا سخاوت علی حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے سید صاحب کی شہادت کے بعد وہ جونپور میں مستقل طور پر جم کر تعلیم و تدریس اور وعظ و تبلیغ میں مصروف رہے، یوپی کے مشرقی اضلاع میں ان کی جد و جہد سے بڑی اصلاح ہوئی، دور دور تک علم کی

روشنی پھیلی اور بدعات وخرافات کے بجائے سنت کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا ہوا،

مولانا سخاوت علیؒ کی نگاہ جوہر شناس نے مولوی فیض اللہ کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا، اور ان کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ کی، مولانا سخاوت علی صاحب کی صحبت اور شفقت کا یہ حال تھا کہ سنہ ۱۲۶۳ھ جب آپ حج کو جانے لگے تو اپنے اس ہونہار شاگرد کو آپ نے مولانا عبدالحلیم لکھنوی متوفی سنہ ۱۲۸۵ھ کے سپرد کر دیا جو اس وقت باندہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، مولانا سخاوت علی صاحب جب حج سے واپس آئے تو مولانا فیض اللہ صاحب پھر ان کی خدمت میں چلے آئے اور یہیں آکر آپ نے درسیات کی بقیہ کتابوں کی تکمیل کی، مولانا سخاوت علی صاحب نے سنہ ۱۲۶۰ھ میں آپ کو سند دی اور سنہ ۱۲۶۴ھ میں سنن نسائی کے اطراف سنا کر ایک سند آپ نے مولانا عبدالرحمٰن معروف بنظیر اعلیٰ سے حاصل کی جو ابتک محفوظ ہے[1]،

درس وتدریس | جن اساتذہ سے آپ نے تعلیم حاصل کی تھی، ان کے طریقۂ درس کے مطابق آپ پڑھتے بھی تھے اور نیچے درجہ کے طلبہ کو پڑھایا بھی کرتے تھے، اس لئے پڑھنے کے بعد درس وتدریس کے لیے آپ کو نہ کسی ٹریننگ کی ضرورت پیش آئی نہ تیاری کی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ پڑھنے کے بعد مولانا فیض اللہ صاحب علمائے صادق پور کی انجمن میں شامل ہو گئے، اور اسی انجمن کے تحت وہ تبلیغی دورے کرتے رہے، مگر سنہ ۱۸۶۳ء میں وہابیوں کو باغی قرار دیدیا گیا، اور علمائے صادق پور کی خانہ تلاشی ہونے لگی تو پٹنہ سے اپنی سسرال بہادر گنج ضلع غازیپور چلے آئے، یہاں بہت دن دنوں تک روپوش رہے، جب اطمینان ہو گیا کہ باغیوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ہے، تو اپنے گھر مئو آئے[2]، اور یہاں آپ نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور گھر ہی پر طلبہ کو پڑھانے لگے، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد طلبہ کے ہجوم کے باعث درس وتدریس کا یہ سلسلہ

[1] روایت عظیمہ خاتون متوفی سنہ ۱۹۲۵ء بہو مولانا فیض اللہ صاحب (بذریعہ عبدالہادی نواسہ عظیمہ خاتون)
[2] مخزن خوبی بیاض قلمی مولانا ابوالمعالی مئوی۔

شاہی مسجد گرہ میں بھی شروع کرنا پڑا[1]۔ لوگوں کا بیان ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں وہ یکہ سے یا پیدل جونپور آتے جاتے تھے، ان کی پہلی منزل اعظم گڈھ ہوتی تھی، کیونکہ اس وقت ریل یا ٹرین کا وجود نہیں تھا، اعظم گڈھ میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ متوفی سنہ ۱۳۱۵ھ کے پاس یا دلی جان وکیل کے والد کے پاس ٹھہرا کرتے تھے، ان سے ان لوگوں کے گہرے مراسم تھے، چنانچہ اسی تعلق کی بنا پر سنہ ۱۲۸۰ھ میں جب اعظم گڈھ میں مدرسۂ اسلامیہ قائم ہوا تو آپ کو اس کا صدر مدرس بنایا گیا، اور اس طرح درس وتدریس کا یہ سلسلہ جس سے ابتک مئو کے لوگ فیض یاب ہو رہے تھے، یہاں سے منتقل ہو کر اعظم گڈھ چلا گیا، اور وہیں آپ اپنے دینی وعلمی فیوض وبرکات سے طلبہ کو مستفید کرنے لگے، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہو کہ

مدرسہ عربیہ اعظم گڈھ میں تھوڑے عرصہ تک . . .

. . . . مولانا سخاوت علی جونپوری مرحوم کے شاگرد مولانا فیض اللہ صاحب مرحوم مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے[2]۔ لیکن مولانا عبدالسلام مبارکپوری متوفی سنہ ۱۳۴۲ھ نے لکھا ہے کہ ملا حسام الدین نے ابتدائی تعلیم تو مئو میں حاصل کی مگر درسیات کا زیادہ حصہ اعظم گڈھ میں . . . .

. . . . . . اپنے شفیق استاد جناب مولانا الحاج محمد فیض اللہ صاحب سے پورا کیا[3]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیض اللہ صاحب نے اعظم گڈھ میں خاصی مدت گذاری ہے، مگر اسکا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ مدت کتنی تھی، مولانا فیض اللہ صاحب نے ملا حسام الدین کو سنہ ۱۲۸۶ھ میں سند دی تھی، گمان غالب یہ ہے کہ اسی سے کچھ آگے پیچھے آپ اعظم گڈھ رہے، اسی دوران میں مولانا شبلی نے بھی آپ سے عربی کی چند کتابیں پڑھیں، اعظم گڈھ میں ملا حسام الدین کے علاوہ مولانا ابوالحسنات عبدالغفور دانا پوری، مولوی ابوالحسن محمد سعد اللہ

[1] اہلحدیث امرتسر ۱۳ فروری سنہ ۱۹۲۰ء [2] حیات شبلی ص ۱۰۱، ۱۰۲، [3] اہلحدیث امرتسر ۶ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

واعظ مولانا عبد اللہ واعظ، حافظ عبد الرحیم مبارکپوری، مولوی سلیم اللہ مئوی اور مولوی خدا بخش اعظم گڈھی نے بھی آپ سے تحصیل علم کی۔[1]

مولانا فیض اللہ صاحب دانا پور جانے سے پہلے علی گنج سیوان میں رہتے تھے، وہاں بھی طلبہ کو پڑھاتے اور وعظ و تقریر کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح کیا کرتے تھے،[2] بعد کو دانا پور گئے، وہاں بھی یہی مشغلہ تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ آخر میں مطب کرنے لگے تھے، اور اسی تعلق سے دانا پور میں رہتے تھے۔[3]

بیعت مولانا فیض اللہ صاحب نے جس دینی ماحول میں ہوش سنبھالا تھا، اس میں دینداروں کی بڑی قدر و منزلت اور ان کی آمد و رفت رہا کرتی، حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلہ کے ایک بزرگ خواجہ سید احمد نصیر آبادیؒ اکثر آیا کرتے تھے، بہت سے لوگ ان سے مرید تھے، مولوی فیض اللہ صاحب کی نظر انتخاب بھی ان ہی پر پڑی، وہ ان کے مرید ہوگئے، اور مرشد کی توجہ سے خلافت سے سرفراز ہوئے، اور لوگوں کو راہ سلوک طے کرانے لگے، آپ غریبوں سے بہت انس رکھتے تھے،[4]

سفر حج ۱۲۸۳ھ میں حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے، ملا حسام الدین کی طالب علمی کا زمانہ تھا

---

[1] ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۱۳۰،

[2] الحدیث امرتسر ۱۳ فروری ۲۰ء۔ [3] حیات شبلی ص ۲، [4] آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، مشائخ کبار میں تھے، اودھ کے بیشتر مقامات کا آپ نے دورہ کیا اور دیہات و قصبات کے ہزاروں مسلمانوں نے شرک و بدعت سے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، دیار پورپ میں آپ کی اصلاحی سرگرمیوں سے بڑا فائدہ ہوا، ۱۲۸۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۳۸، ۳۹ نیز مضمون مولوی ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ اپریل ۶۴ء تا ۱۰ اکتوبر ۶۴ء، الحدیث امرتسر ۱۳ فروری ۲۰ء۔

انھوں نے اس موقع پر ایک دلچسپ اور پُر اثر نظم لکھی۔

وفات آپ کی وفات ۱۳ ربیع الآخر بوقت عصر بروز دوشنبہ ۱۳۰۶ھ میں ہوئی، دانا پور سے دو روز کے لیے اپنے بڑے بھائی حکیم رکن الدین صاحب کی عیادت کے لیے مکان تشریف لائے، دانا پور واپس پہونچنے کے چوتھے یا پانچویں دن پنجشنبہ کو حسب دستور آپ نے وعظ فرمانا شروع کیا، اثنائے وعظ میں شدید قے ہوئی، اور بے ہوش ہوگئے، تین چار روز تک اسی حالت میں مبتلا رہے، وہاں کے حکیموں نے بہت کچھ علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ جنازہ میں وہ کثرت تھی کہ یہاں کے کسی رئیس کے جنازہ میں بھی نہیں ہوئی، بڑے بڑے رؤسا فضلا حکما آپ کے جنازہ میں شریک تھے، راہ میں جنازہ لے چلنے پر ہر شخص سبقت کرنے کی کوشش کرتا تھا، اس کی وجہ سے کتنے لوگوں کے کپڑے پھٹ گئے۔[1]

تاریخ وفات متعدد لوگوں نے آپ کی تاریخ وفات لکھی لیکن یہاں مولانا ابو المعالی محمد علی کی قلمی بیاض سے مولوی خلیل الرحمن صاحب کے یہ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو شاید ابتک طبع نہیں ہوئے، ؎

در بہشت آمد چوں آں رضواں مآب	استیں بگرفت رضوان بہشت
حوریاں گفتند از ہر سو بیا	مرحبا اے تازہ مہمان بہشت
در جہاں چوں سیرت درویش داشت	نام او کردند سلطان بہشت
سال تاریخ وفاتش خواستم	نامہ زد کلکم چون مرغان بہشت

ہاتفے گوئے ندا زد کائے خلیل،
جائے وے باد اگلستان بہشت[2]

---

[1] الدہر الاحمر ص ۲۰۔ [2] بیاض فیضی قلمی،

اولاد آپ کے چار لڑکے تھے۔[1] تین تو آپ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے، صرف ایک لڑکے مولانا محمد علی ابوالکلام زندہ رہے، جن کا ۱۳۵۲ھ میں انتقال ہوا، وہ مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردوں میں تھے، ریاست بھوپال سے وظیفہ ملتا تھا، مختلف مسائل پر بہت سے رسائل تصنیف کئے، حیاتِ شبلی کے حاشیہ میں ایک جگہ موصوف کا ذکر آیا ہے، نزہۃ الخواطر اور تذکرہ علماء حال میں بھی آپ کا تذکرہ ہے۔

تصانیف اور تلامذہ مولانا فیض اللہ صاحب کی کوئی اہم تصنیفی یادگار نہیں، انھوں نے صرف ایک رسالہ سوط الرحمٰن تالیف کیا، لیکن آپ کے تلامذہ میں بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں غیر معمولی شہرت حاصل کی، ان میں علامہ شبلی کے علاوہ مولانا عبدالغفار مئوی، مولانا ابوالحسنات عبدالغفور دانا پوری، مولانا ابوالمعالی مئوی، مولانا عبدالقادر ابوالفیاض مولانا محمد شفیع بانی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، مولانا خلیل الرحمٰن، مولانا خدابخش وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتب خانہ مولانا فیض اللہ کے پاس مختلف اسلامی علوم وفنون کی گرانقدر کتابوں پر مشتمل ایک عظیم ذاتی کتب خانہ بھی تھا، انھوں نے ملک کے دوسرے ممتاز کتب خانوں میں سے عربی کی نادر ونایاب کتابیں نقل کرا کے اپنے یہاں محفوظ کی تھیں، جن میں علامہ ہاشم سندھی کی دراہم الصرۃ فی وضع الیدین تحت السرۃ، علامہ سیوطی کی انتباہ الاذکیا فی حیاۃ الانبیاء اور ان کے دوسرے متعدد رسائل، امام حازمی کی الناسخ والمنسوخ، حسین بن ہلال یمنی کی عدۃ المنسوخ من الحدیث اور ملا علی قاری کے متعدد رسائل اور احادیث کے کئی مجموعے خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔

---

[1] اہل حدیث امرتسر ۲۶ء

اکابر کی نظر میں صاحب نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحیٔ لکھتے ہیں،

وکان علی قدم شیوخہ	اپنے شیوخ کے طریقہ پر آپ نے سنت
فی اتباع السنۃ السنیۃ	مبارکہ کی اتباع کی، سلف کے طریقے
واقتفاء آثار السلف،	پر رہے اور درس وتدریس اور وعظ
یدرس ویفید۔[1]	وتبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہونچایا

مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری جو اکابر علمائے اہل حدیث میں ہیں، مولانا فیض اللہ کو "رئیس العلماء" اور "اسوۃ الفضلاء الکرام" جیسے بلند الفاظ سے ... یاد کرتے ہیں، اسی طرح حکیم عبدالحفیظ لکھنوی نے آپ کو "بحر المواج" اور "سراج الوہاج" لکھا، جس سے نہ صرف آپ کی عظمت اور بزرگی کا پتہ چلتا ہے، بلکہ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے، کہ آپ کا اپنے وقت کے علماء واکابر کی نظر میں کیا مقام تھا، اور اہل علم طبقہ میں کس قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

مسلک آپ بے باک غیر مقلد تھے نہ جامد مقلد، کتاب وسنت پر عمل کرتے تھے، مگر گروہی عصبیت سے بری تھے ... فروعی مسائل میں تشدد کے قائل نہیں تھے، دین کی بنیادی باتوں پر زور دیتے اور تعلق مع اللہ، اتباع سنت تزکیۂ اخلاق اور درستی اعمال کی طرف زیادہ توجہ فرماتے، یہ شاید حسن اتفاق ہی تھا کہ اساتذہ بھی آپ کو ایسے ملے تھے، جن کے اندر تعصب اور گروہی عصبیت بالکل نہ تھی، علمی اور فقہی مسلک میں وہ وسیع النظر اور معتدل مزاج تھے، اپنی استعداد کے مطابق مولانا فیض اللہ صاحب نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا، اور اپنے اساتذہ کی طرح خود بھی آپس کے اختلاف اور گروہی عصبیت سے ہمیشہ دامن کشاں رہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۸، ص ۳۶۹

آپ کے صاحبزادے مولانا محمد علی ابو المکارم ایک پُرجوش اہل حدیث عالم تھے، جو اختلافی مسائل پر بحث ومناظرہ کے لئے ہر وقت تیار رہا کرتے تھے، لیکن خود مولانا فیض اللہ صاحب نے کبھی اپنے آپ کو اختلافی مسائل میں نہیں الجھایا، کیونکہ ان کے نزدیک یہ غیر ضروری اور غیر مفید ہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے یہ طرز عمل مضرت رساں تھا ان کے نزدیک اصل کام یہ تھا، کہ قرآن وحدیث کی بنیادی تعلیم کو پھیلایا جائے، توحید کی دعوت کو عام کیا جائے، بدعتوں کو مٹایا جائے، اور مردہ سنتوں کو زندہ کیا جائے، یہی ان کے نزدیک سب سے بڑا کام تھا، اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت، چنانچہ ساری زندگی وہ اسی کام میں لگے رہے،

آپ کی رواداری اور اعتدال پسندی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں مئو کے حنفی اہل حدیث جھگڑے میں جو صلحنامہ لکھا گیا جس پر وہاں کے تقریباً سبھی قابل ذکر علماء کے دستخط ہیں، وہ سب کی متفقہ رائے سے آپ ہی کے پاس رکھا گیا،[۱] مولانا فیض اللہ صاحب رفع یدین بھی نہیں کرتے تھے۔[۲] اور نہ بیعت کو خلاف شرع سمجھتے تھے، مولانا خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے بیعت تھے، آپ کے استاد مولانا سخاوت علی صاحب بھی حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز تھے، ان کا ذہن غلو اور افراط سے پاک تھا، وہ توحید وسنت کے متبع اور سلف صالحین کے پیرو تھے ان کے مسلک کو ہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مسلک کہہ سکتے ہیں جس میں ائمہ مجتہدین کی اتباع بھی ہے، اور تعظیم بھی، لیکن جمود نہیں، طبیعت کے اسی

---

[۱] فرحۃ الاخیار مصنفہ ملا حسام الدین ص ۵۔ [۲] اشتہار لیاقت آثار۔ از عبدالرحمن ابو النعمان مئو اعظم گڈھ ۱۲ر شوال ۱۳۱۴ھ مطبوعہ مجتبائی پریس لکھنؤ

رجحان نے شاید آپ کو خواجہ احمد نصیر آبادی کی خدمت میں پہونچایا، اور اسی ذوق کی بنا پر خواجہ سید امین نصیر آبادی[۱] سے آپ کے تعلقات استوار ہوئے، چنانچہ موصوف یعنی خواجہ سید امین نصیر آبادی ایک بار مئو آئے، مولانا فیض اللہ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تو ایک خط لکھا ہے، جس سے ان کے مابین خلوص ومحبت کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خط حسب ذیل ہے،

محبی مولوی فیض اللہ صاحب　　بعد سلام

صبا بگلشن احباب من اگر ہمی گذری　　اذا لقیت حبیبی فقل لہ خبری

تراچہ شود کہ مارا یہ ہجری سوزی　　فان رضیت بہذا رضیت فی ضرری

مدرسہ عالیہ کا قیام آپ کا ایک زندہ جاوید کارنامہ مئو میں مدرسہ عالیہ کا قیام ہے، اس سے پہلے مئو میں کوئی باقاعدہ عربی درسگاہ نہیں تھی، بلکہ طلبہ کے مختلف اہل علم کے مکانات پر جاکر تعلیم حاصل کرنے کا رواج تھا، مولانا فیض اللہ نے اس اہم ضرورت کو محسوس کیا، اور دوسرے علماء کے مشورے سے ۹۱-۱۲۹۰ھ میں ایک مسجد میں مدرسہ عالیہ کے نام سے باقاعدہ درسگاہ قائم کی، جس میں آپ کے تلمیذ رشید ملا حسام الدین پہلے مدرس مقرر ہوئے، آج یہ درسگاہ ملک وبیرون ملک کے تشنگان علم کا مرجع ہے،

اخلاق وکردار مولانا حد درجہ شریف نیک صلح پسند متواضع اور ملنسار تھے، اس لئے ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگ ان کا احترام کرتے اور ان سے تعلق رکھتے، لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ مولانا گھر آرہے ہیں،

---

[۱] بڑے جاہ وجلال کے بزرگ تھے، دیار پورب میں آپ کی دینی واصلاحی سرگرمیوں سے بڑی اصلاح ہوئی، مئو اکثر آتے جمعہ کے دن جامع مسجد میں بیان ہوتا تقلید وعدم تقلید آمین بالسر والجہر وغیرہ لاطائل مباحث پر جھگڑتے اور جمعہ وجماعت میں تفریق ڈالنے کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھتے، اور زبان سے اس کا اظہار بھی فرماتے،

تو میلوں سے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتے

مواعظ و نصائح وعظ و نصیحت کے ذریعہ دین کی بات لوگوں تک پہونچانا انبیاء کرام کی سنت ہے، اور علماء و اہل اللہ نے ہمیشہ اس سنت پر عمل کیا ہے، مولانا فیض اللہ صاحب بھی اس سنت پر عمل کرتے اور جہاں رہتے جمعہ کو بالالتزام آپ کا بیان ہوتا، آواز بلند تھی زبان میں اثر تھا، لوگ دور دور سے آپ کا وعظ سننے آتے اور متاثر اور مستفید ہوتے، مولانا عبدالرحمٰن ابو النعمان لکھتے ہیں۔

> خدا نے علاوہ اور کمالات و فضائل کے قوت بیانیہ اور جوہر تقریر بھی ایسا بخشا تھا کہ جس جلسہ میں آپ رہتے لوگ نہال ہو جاتے، ہمیشہ بعد نماز جمعہ وعظ بیان فرماتے اور اس طرز و ادا سے فرماتے کہ جملہ سامعین کی یہ حالت ہوتی، کان علی رؤسہم الطیر۔ ایک سکتہ کا عالم رہتا، اور ایسے ایسے نکات قرآنیہ اور رموز فرقانیہ بیان کرتے کہ لوگوں پر ایک خاص اثر ہوتا اور اکثر لوگ روتے روتے بدحواس ہو جاتے ہیں[1]

زندگی بھر مولانا کا یہی مشغلہ تھا، کتابوں کا درس بھی دیتے، وعظ و تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتے اور سلوک و تصوف کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح بھی کرتے، پوری زندگی اس طرح بسر کر دی آپ کے ذریعہ مخلوق کو بہت فائدہ پہونچا اور اطراف و جوانب میں اتباع سنت کا جذبہ پیدا ہو گیا

---

[1] اہلحدیث امرتسر ۱۳ فروری ۱۹۲۰ء

حیات شبلی

مولفہ۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔

ادبیات

غزل

از جناب عبدالباری صاحب عشق خلف منشی ممتاز علی آہ مرحوم تلمیذ امیر مینائی مرحوم

دل میں رہتے ہیں دل آزار یہ کیا — اتنے پیارے ہیں ستمگار یہ کیا

خود تو ہیں در پئے آزار مرے — یاد اُن کی مری غمخوار ہے کیا

تم مری جان مسیحائے زماں — اور پھر میں رہوں بیمار یہ کیا

تیری صورت تو بہت بھولی ہے — اور تو ایک ہی عیّار یہ کیا

دل مرا جان مری دین مرا — سب کے وہ مالک و مختار یہ کیا

جس کا خواہاں وہ ہستی ہے مری — آپ اپنا ہوں طلب گار یہ کیا

دعوتِ عشق ابھی سے ہے یہاں — حشر پر وعدۂ دیدار یہ کیا

چھینے لیتے ہیں مرا دل کیوں آپ — سنئے تو دیکھئے سرکار یہ کیا

عشق کہتی ہے طبیعت اپنی
کہئے شعرا ذرا بھی دوچار یہ کیا

غزل

از ڈاکٹر سلام سندیلوی۔ ریڈر شعبۂ اردو۔ گورکھپور یونیورسٹی

جن کا شعور خام ہے، وہ نئی وضع میں ڈھلے — ذوق ہمارا پختہ ہے، اپنی ہی چال ہم چلے

صحن چمن سے چرخ تک، جگنوؤں کی بہار ہے — چمکتے ہیں اپنے اشک ہم، بیٹھے ستاروں کے تلے
جن میں ہے شعلۂ حیات دیتے ہیں خود بخود وہ لو — تاروں کے نقرئی چراغ، شام کے وقت خود جلے
تیز ہوا کے جھونکے نے، کانٹے پڑے ہیں راہ سے — گلشن کائنات میں، اب بھی ہیں لوگ کچھ بھلے
یہ بھی کوئی بہار ہے، چند شگوفے کھل گئے — آئی ہے فصل گل اگر، نخل حیات بھی پھلے

ایسا نہ ہو کہ پھونک دیں، برق کے آشیانے کو — شمع طلب کے آس پاس جمع ہوئے ہیں دل جلے
گلچیں کو گر نہیں ہے یاد، باد صبا بتائے گی — باغ کے لالہ و گلاب، اپنے ہی خون سے پلے
پھول ہوں چاہے خار ہوں مری نظر میں ایک ہیں — ان کو بھی کر لیا سلام ان سے بھی گر اہل لئے گلے
لے گئی آسمان تک ان کو شباب نو کی دھوپ — آئیں گے آشیانوں میں سارے طیور دن ڈھلے
ان کو بچا سکے گا کون، گلچیں کے دست جور سے — نکلے ہیں کچھ حسین پھول غازۂ صبح نو لئے

آئی ہے کیوں اجل سلام، جب ہے حیات ناتمام
چھوڑیں ہم اپنے کام کیوں موت کا وقت خود ٹلے

کلام شبلی

مترجمہ جناب اکبر علی خاں عرشی زادہ (رام پور)

کیا جانوں گبر ہوں کہ مسلماں نہیں ہوں میں؟ — کچھ بھی سہی یہ زاہد ناداں نہیں ہوں میں
میرے جنوں کو چرخ ستم گر سے کیا خطر — دون طبع وہ، تو مایۂ ارزاں نہیں ہوں میں
ہوں چارہ گرچہ آپکے جاں بخش لعل لب — پھر کیوں کہوں کہ لائق درماں نہیں ہوں میں
دعوائے عقل گرچہ نہیں ہے و لے مجھے — ہم مایہ مثل ناصح ناداں نہیں ہوں میں
فرصت ملے تو زندی و مستی بھی کر دکھاؤں — رسم ریا کا صاحب میداں نہیں ہوں میں
چاہو نہ مجھ سے شعر و سخن بھی ہے دور — شبلی ہوں اب، وہ رند غزلخواں نہیں ہوں میں

مطبوعات جدیدہ

حیات خلیل مرتبہ مولانا محمد ثانی حسنی ندوی مظاہری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۶۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت عنعہ، پتے (۱) مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ (۲) کتب خانہ یحیوی مظاہر علوم، سہارن پور۔

مولانا خلیل احمد سہارن پوری صاحب بذل المجہود کے حالات و سوانح میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی "خوان خلیل" اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی "تذکرۃ الخلیل" پہلے سے موجود تھیں، مگر اب جدید طرز کی ایک سوانح عمری کی ضرورت تھی اس لئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے ایما و تحریک سے مولانا محمد ثانی نے اس کام کو انجام دیا ہے جن کو شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف کی سوانح عمری مرتب کرنے کے سلسلہ میں دیوبند و سہارن پور کے قرب وجوار کے قصبات اور ان کے علمی و دینی خانوادوں سے پوری واقفیت تھی، یہ کتاب دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ دس اور دوسرا آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے میں صاحب ترجمہ کی ولادت سے وفات تک کے حالات و واقعات زندگی درج ہیں، اور دوسرے میں ان کے علمی، دینی اور روحانی کمالات بیان کئے گئے ہیں، پہلے باب میں مولانا کے خاندانی حالات بہت کد و کاوش سے لکھے گئے ہیں، اس میں ان کے ننہالی اور ددھیالی متعدد بزرگوں کا مختصر تذکرہ ہے دوسرے باب میں مولانا کے عہد اور ماحول کا بیان ہے، اس میں دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور اور متعدد ممتاز اشخاص اور مشہور علمی و دینی خانوادوں کے علاوہ حضرت مجدد صاحب

شاہ ولی اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی دینی تحریکوں اور ان سے مولانا اور ان کے اکابر کے تعلق کا ذکر ہے، اس کے بعد مولانا کی ولادت، تعلیم، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ان کی بیعت و ارادت اور اجازت و خلافت، مختلف مدرسوں سے تعلق، مظاہر العلوم کی صدر مدرسی، نظامت مدرسہ، طریقۂ تعلیم، درس و تدریس کے معمولات و خصوصیات، سات دفعہ حج کرنے اور بعض اہل بدعت و اہل تشیع سے مناظروں کی روداد، تحریک ندوۃ العلماء کی تائید اور اس کے پہلے جلسہ میں شرکت، مدینہ منورہ میں مستقل قیام اور وہاں کی مشغولیتوں، نیز علالت و وفات اور جنت البقیع میں تدفین اور اولاد وغیرہ کا مفصل ذکر ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے علم و فضل، ورع و تقویٰ، اتباع سنت، عبادت و ریاضت سے شغف، روز و شب کے معمولات، اوصاف و اخلاق، ارشادات و ملفوظات، بعض خاص افکار و خیالات، فقہی مسائل میں معتدل رویے اور تصنیفات وغیرہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اس حصہ میں مصنف نے مولانا کے متعلق متعدد اکابر جیسے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولانا محمود الحسنؒ، مولانا تھانویؒ، مولانا مدنیؒ، حکیم سید عبدالحیؒ وغیرہ اور بعض علمائے مدینہ کی رائیں اور تاثرات بھی نقل کئے ہیں اور ایک باب میں ان کے اہم خلفاء، مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ اور ان کے برادر خورد و بانی تحریک تبلیغ مولانا محمد الیاسؒ اور فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے مختصر حالات لکھے ہیں، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا مقدمہ بھی قابل مطالعہ ہے، یہ کتاب بڑی دیدہ ریزی اور محنت سے لکھی گئی ہے جو تنہا ایک شخص کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ گذشتہ صدی ہجری کے نصف آخر اور موجودہ صدی کے نصف اول کی علمی، تعلیمی اور دینی تاریخ ہے اور یہ مظاہر العلوم اور دار العلوم دیوبند اور ان کے متعدد اکابر و مشائخ کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ ہے لیکن

اس کی ضخامت سے ممکن ہے بعض قارئین کو اکتاہٹ ہو، اگر لائق مصنف واقعات کو سمیٹ کر لکھتے اور تکرار سے بچتے، نیز طویل اقتباسات کو جو عموماً فائدہ سے خالی نہیں ہیں حذف کر دیتے تو کتاب کا حجم کم ہو جاتا، مولانا کی تصنیفات کا تعارف مختصر ہے، بذل المجہود جو ان کا بڑا کارنامہ ہے تعارف بھی مختصر ہے۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل — مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت [illegible]، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

یہ پانچ مضامین کا مجموعہ ہے (۱) فقہ اسلامی کا دائرۂ کار، (۲) فقہ اسلامی کے بنیادی مآخذ (۳) شریعت اسلامی کے ضمنی مآخذ (۴) اسلامی قانون اور عرف و عادت (۵) فساد زمانہ اور عموم بلویٰ۔ موخر الذکر چاروں مضامین کئی سال پہلے معارف میں چھپ چکے تھے، پہلے مضمون میں فقہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف، اور اس کے دائرۂ کار کا ذکر کرکے اس کی جامعیت دکھائی گئی ہے، اور اس کے بارہ میں پھیلی ہوئی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، دوسرا اور تیسرا مضمون جدید قوانین اور اسلامی قانون کے ماہر اور دمشق یونیورسٹی کے لا کالج کے پروفیسر مصطفےٰ احمد زرقا کی مشہور کتاب "المدخل الفقہی" کے دو ابواب کا اردو ترجمہ ہے، ان میں اسلامی فقہ کے بنیادی مآخذ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس و اجتہاد اور ضمنی مآخذ استحسان، مصالح مرسلہ اور عرف وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، چوتھے میں اسلامی قانون میں عرف و عادت کی حیثیت اس کے مفہوم، شرعی دلائل اور مختلف قسموں کا ذکر ہے، نیز اس میں اور بنیادی مآخذ میں اختلاف و تعارض کی صورت میں کسی ایک کے اخذ و ترک کے اصول و حدود بیان کئے گئے ہیں، پانچویں میں اس کا ذکر ہے کہ عموم بلویٰ اور فساد زمانہ کی وجہ سے کن احکام میں اور کب تبدیلی ہو سکتی

ہے نیز منصوص احکام کی تخفیف عدم تخصیص کیا اصول ہیں یہ دونوں بحثیں بہت نازک ہیں لیکن مصنف نے ان کے متعلق محتاط اور متوازن گفتگو کی ہے، گو ان کی شدت پسندی نے کہیں کہیں اس لچک اور گنجایش کو بھی باقی نہیں رہنے دیا ہے، جو اسلامی قانون کی اہم خصوصیت ہے، مصنف کی نظر صرف احناف کے مسلک تک محدود نہیں رہی، بلکہ انھوں نے شافعی و مالکی فقہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور مسائل کی وضاحت اور مثالیں پیش کرنے میں ان سے بھی مدد لی ہے، وہ فقہ اسلامی کی جدید تشکیل و ترتیب کے قائل ہیں، یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، لیکن دو ایک مثالوں کے سوا سب ہی مثالیں قدیم ہیں، اور موجودہ دور کے فقہی مسائل سے کتاب میں اصلاً تعرض نہیں کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ نام کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا، مشہور حدیث (لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق الخ) کو آیت (ص ۲۴۳ و ۲۴۴) اور حضرت علیؓ کے قول (لا تنقضی عجائبہ) کو حدیث (ص ۲۰) بتایا ہے کتابت و طباعت کی غلطیاں بہت ہیں آیات و احادیث تک کے اندراج میں صحت کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔

مشروع اور ممنوع وسیلہ کی حقیقت - مترجمہ مولانا مختار احمد سلفی ندوی تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۳ قیمت تحریر نہیں، ناشر الدار السلفیہ، حامد بلڈنگ، مومن پورہ، مولانا آزاد روڈ، بمبئی ۱۱

وسیلہ کا مسئلہ مسلمانوں میں عرصہ سے اختلاف و نزاع کا باعث بنا ہوا ہے، اس پر شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے ایک نہایت مفید رسالہ لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ بہت پہلے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے کیا تھا، مگر اب وہ کمیاب اور کسی قدر دقیق بھی ہے، اسلئے مولانا مختار احمد ندوی نے اس موضوع پر یہ عام فہم کتاب شائع کی ہے، یہ دراصل ایک حلبی عالم شیخ محمد نسیب رفاعی کے ایک رسالہ "التوصل الی حقیقۃ التوسل" کا شگفتہ اردو ترجمہ ہے، اس کے شروع میں

موجودہ دور کے مشہور فاضل علامہ محمد ناصر الدین البانی کے اسی موضوع سے متعلق ایک رسالہ کے بعض مفید مباحث کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کتاب میں وسیلہ کی حقیقت اسکے مفہوم، اس کی جائز و ناجائز صورتوں پر کتاب و سنت اور ائمۂ سلف کے اقوال کی روشنی میں مدلل گفتگو کی ہے، آخر میں ممنوع وسیلہ کے قائلین کے دلائل کا رد ہے لیکن اس حصہ کے بعض مباحث زیادہ تشفی بخش نہیں ہیں، کہیں کہیں طوالت اور تکرار سے بھی کام کیا گیا ہے، تاہم جو لوگ سنجیدگی سے اس مسئلہ کی صحیح نوعیت سمجھنا چاہتے ہوں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے،

آشوب آگہی - از جناب سید رفیع الدین احمد رحمانی سالک تقطیع متوسط
کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۲
پتہ - شعبہ نشر و اشاعت سنی سنٹرل وقف بورڈ، لکھنؤ

جناب رفیع الدین سالک ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج کو شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے سرکاری ملازمت کے باوجود انھوں نے اپنے اس ذوق کو برقرار رکھا، یہ ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے، شروع میں چند نعتیں اور آخر میں کچھ قطعات ہیں، موجودہ دور میں علم و آگہی کی زیادتی اور مادی ترقی کے باوجود انسانی معاشرہ جس ذہنی و اخلاقی پستی اور انتشار و تعطل کا شکار ہے، اس سے مصنف کا وجدان و شعور پوری طرح متاثر ہے یہ غزلیں اسی احساس و تاثر کا نتیجہ ہیں، سالک صاحب نے غزل کے رموز و علائم کے پردہ میں اس دور کے حالات کی عکاسی کی ہے، اس حیثیت سے یہ مجموعہ اسم با مسمی ہے،

ذکر مجذوب - مرتبہ پروفیسر احمد سعید تھانوی، کاغذ کتابت و طباعت بہتر تقطیع متوسط صفحات ۱۸۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲ روپیہ پتہ - الاشرف مطبوعات، عالمگیر روڈ - لاہور۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری مولانا اشرف علی تھانوی کے اجل خلفا میں تھے اس نسبت کے علاوہ وہ ایک ممتاز شاعر اور بڑے باغ و بہار شخص بھی تھے، اس کتاب میں انکی زندگی کے ان ہی مختلف دلآویز پہلوؤں کا ذکر ہے اس سے مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے اہم خلفا کی نظر میں خواجہ صاحب کی اہمیت و عظمت اور خود ان کی اپنے مرشد سے عشق اور والہانہ تعلق کا پتہ چلتا ہے، اس میں خواجہ صاحب کے کلام پر مفصل تبصرہ اور آخر میں اس کا مختصر انتخاب بھی دیا گیا ہے، "ذکر مجذوب" کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے،

اردو طباعت و اشاعت کے مسائل - مرتبہ جناب انور کمال حسینی صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت

و طباعت عمدہ صفحات ۹۶ قیمت مئعر - پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا مرکزی وزارت تعلیم کے ماتحت ایک خود مختار ادارہ ہے، اسکے پروگرام میں ہندوستان کی مختلف اہم زبانوں کی منتخب کتابوں کی اشاعت کے علاوہ طباعت و اشاعت کی دشواریاں حل کرنا بھی ہے، چنانچہ اسکے زیر اہتمام مختلف زبانوں کے اشاعتی مسائل کے سلسلہ میں متعدد سمینار ہو چکے ہیں اردو طباعت کی مشکلات کا جائزہ لینے کیلئے جون ۱۹۷۶ء میں ایک سمینار سری نگر (کشمیر) میں ہوا تھا جس میں اردو کے مختلف اہل قلم اور طباعت و اشاعت کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک تھے اس کتاب کے شروع میں سمینار کی رپورٹ، تجویزیں اور سفارشات درج ہیں اور آخر میں اس میں پڑھے جانے والے تمام مضامین دئے گئے ہیں ان مضامین میں طباعت و اشاعت کی مختلف پیچیدگیوں سے بحث کی گئی ہے جیسے اردو کتابوں کی خرید و فروخت، کتبخانوں، ناشروں، مصنفوں، نئے اہل قلم، بچوں کے ادب، مذہبی و فنی کتابوں، ترجمہ و طبعزاد تصنیفات کے مسائل وغیرہ، اکثر مضامین میں گزشتہ تیس سال کے اندر اردو پر جو سخت وقت گزرا ہے اسکا دکھڑا اور اس ضمن میں آزادی سے پہلے اردو کتابوں کی طباعت کی بہتر اور موجودہ دور میں ابتر حالت کا ذکر آگیا ہے، دارالمصنفین کے شریک ناظم مولانا عبدالسلام قدوائی کو بھی سمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا، ذاتی علالت و مصروفیت کی وجہ سے اس میں شریک نہیں ہو سکے لیکن انکا مقالہ پڑھا گیا اور وہ اس کتاب میں شامل بھی ہے، انھوں نے تقسیم سے پہلے اور بعد کے متعدد ایسے اہم اشاعتی اداروں کی خدمات بھی دکھائی ہیں جو مذہبی کتابیں شائع کرتے تھے اور انکی طباعت کی موجودہ حالت اور پریشانیوں کا ذکر بھی کیا ہے، رپورٹ میں مضامین پر اظہار خیال کرنے والوں کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، یہ سب چیزیں بہت مفید ہیں اور اس حیثیت سے یہ سمینار کامیاب تھا دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ طباعت و اشاعت کی مشکلات رفع کرنے کیلئے کیا اقدام کیا جاتا ہے، "ض"

جلد ۱۲۲ ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۸ء عدد ۵

مضامین

شذرات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۳۲۲-۳۲۴

مقالات

سلطنت اور دین کا تعلق	مولانا سید سلیمان ندویؒ	۳۲۵-۳۳۵
راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں	جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ال ال بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش،	۳۳۶-۳۷۲
خطیب بغدادی اور اُن کے مخطوطات	ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۷۳-۳۸۱
امام مزنی	حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین	۳۸۲-۳۹۶
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۳۹۷-۴۰۰

جلد کے نمبروں کی تصحیح

ماہ اگست ۱۹۷۶ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک معارف کی جلدوں کے نمبر غلط ہو گئے ہیں اگست ۱۹۷۶ء کا جلد نمبر ۱۱۸ اور اکتوبر ۱۹۷۸ء کا ۱۲۲ ہے، ناظرین اگست ۱۹۷۶ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک جلد کے نمبروں کی تصحیح کرلیں،

"اڈیٹر"